www.cpsglobal.org
www.mwkhan.com

الرسالہ
Al-Risala

July-August 2025 • Rs. 50

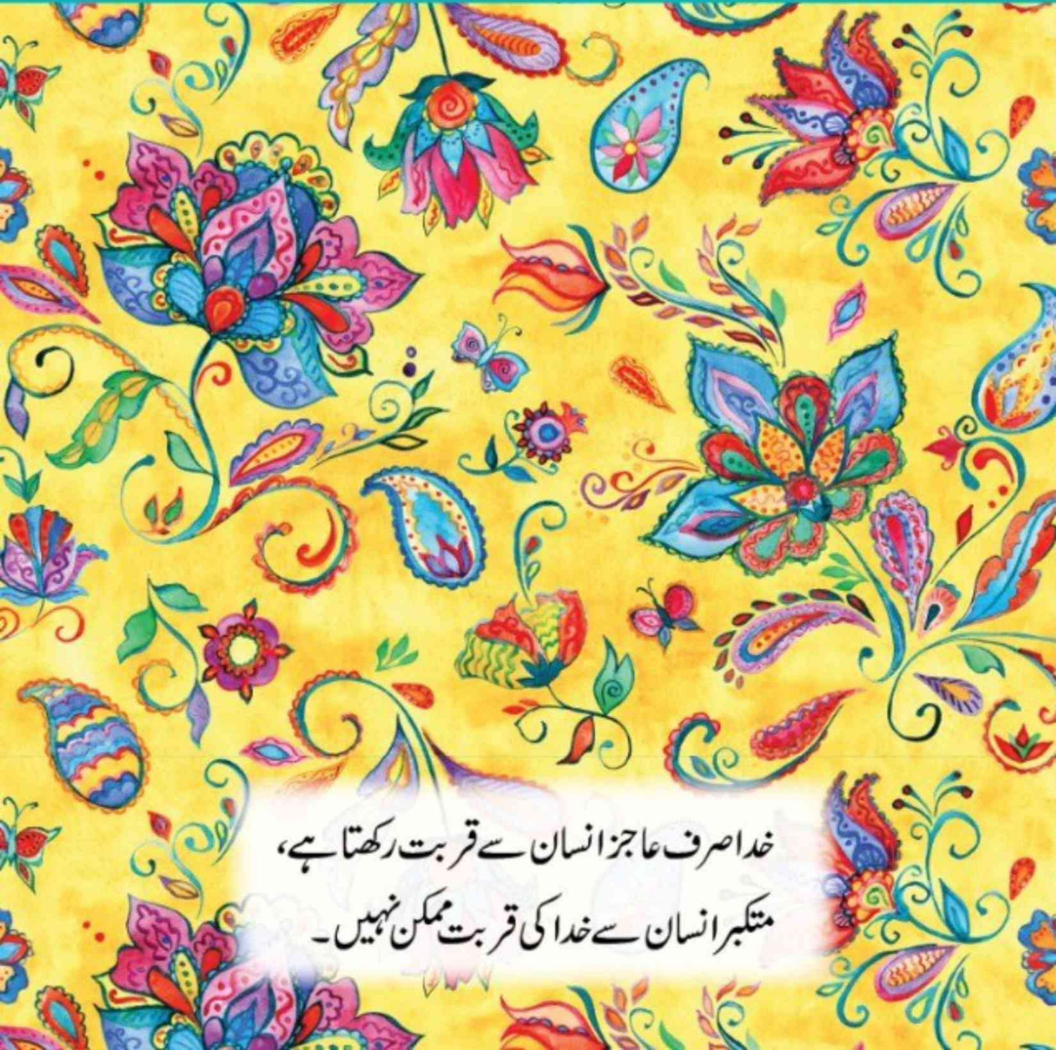

خدا صرف عاجز انسان سے قربت رکھتا ہے،
متکبر انسان سے خدا کی قربت ممکن نہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ

Jul-Aug 2025 | Volume 50 | Issue 4

Prof. Farida Khanam
Editor-in-Chief

Dr. Stuti Malhotra
Editor (Hindi Section)

Farhad Ahmad
Assistant Editor

Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi 110013
Mobile: 8588822679, Tel. 0120 4314871
Email: info@goodwordbooks.com

Annual Subscription Rates

Retail Price	₹40 per copy
Subscription by Book Post	₹200 per year
Subscription by Regd. Post	₹400 per year
Subscription (Abroad)	US $20 per year

Bank Details
Saniyasnain Khan
State Bank of India
A/c No: 30087163574
IFSC Code: SBIN0009109

UPI
UNIFIED PAYMENTS INTERFACE

To order books by
Maulana Wahiduddin Khan
please contact Goodword Books
Tel. 0120 4314871, Mobile: 8588822675
Email: sales@goodwordbooks.com

تحریر

مولانا وحید الدّین خاں

فہرست

ایمانی شخصیت کا ارتقا 4
سیلف ڈسکورڈ معرفت 5
تفکیر صحیح کا اصول 6
تلاش حق 7
شیطان کا چیلنج 8
خدا کا خوف 9
ذکر کی عظمت 10
صحابہ اور تابعین 11
صحابہ کی احتیاط 12
ایک قرآنی پیشین گوئی 13
صحت فکر 14
نجات کیا ہے 15
تنگی کا جینا 16
مستقبل کی طرف 17
سازش بے اثر 18
صبر کیا ہے 19
شاک ٹریٹمنٹ 20
سچا شکر 21
شکر کا ایک آئٹم 22
فخر کی خوراک 23
شادی شدہ زندگی 24
مومن کا ہتھیار 25
غلط نشانے کا مسئلہ 26
سچائی کی دریافت 27
کامیابی کا اصول 28
خیر کا راستہ 30
سائنس کا رجحان 32
خالق کا وجود 33
سیاسی اقتدار 34
مین میڈ، گاڈ میڈ 36
اسپین کا سبق 39
ڈائری 1986 40
حکمت کیا ہے 46
ایک انٹرویو 47
سادگی کی اہمیت 50

हर चीज़ एक इम्तिहान का पेपर है 1
आत्महत्या: सबसे बड़ा पागलपन 2
आसान विकल्प का चयन—एक सुन्नत 3
जीवन के उस पार 7
गंतव्यहीन दौड़ 9
हर तरफ़ बेखौफ़ी 10
अपने लिए पूरा, दूसरों के लिए अधूरा 12
ऐसी शानदार चीज़ें खुदा के यहाँ कहाँ! 14

Printed and published by Saniyasnain Khan on behalf of Al-Markazul Islami, New Delhi
Printed at Tara Art Printers Pvt. Ltd. A46-47, Sector 5, Noida-201301
Published from 1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110013 Editor: Saniyasnain Khan

ایمانی شخصیت کا ارتقا

درخت ایک نموپذیر ظاہرہ ہے۔ درخت کا بیج یا اس کی شاخ جب زرخیز زمین میں لگادی جائے تو وہ اپنے آس پاس سے غذا لے کر بڑھنا شروع ہوجاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک مکمل درخت بن جاتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: أَلَمْ تَرَ كَيْفَ ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ ۔ تُؤْتِي أُكُلَهَا كُلَّ حِينٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (14:24-25)۔ یعنی کیا تم نے نہیں دیکھا، کس طرح مثال بیان فرمائی اللہ نے کلمۂ طیبہ کی۔ وہ ایک پاکیزہ درخت کی مانند ہے، جس کی جڑ زمین میں جمی ہوئی ہے اور جس کی شاخیں آسمان تک پہنچی ہوئی ہیں۔ وہ ہر وقت پر اپنا پھل دیتا ہے اپنے رب کے حکم سے۔ اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

درخت کا پودا اس طرح بڑھتا ہے کہ وہ زمین سے اپنی غذا لیتا رہتا ہے، مثلاً پانی، کھاد اور منرل (mineral)، وغیرہ۔ درخت کی غذا مادی غذا ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں مومن کی غذا ذہنی غذا ہوتی ہے۔ مومن فکری معنوں میں اپنے آس پاس کی دنیا سے غذا لیتا ہے، اور اس طرح اپنے ایمانی وجود کو مسلسل طور پر بڑھاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک مکمل مومن بن جاتا ہے۔

مومن کی غذا یہ ہے کہ وہ اپنے تجربہ اور مشاہدہ سے ایسے اسباق حاصل کرے، جو اس کے ایمان کو ترقی دینے والے ہوں، جو اس کے اندر آخرت کا یقین پیدا کریں، جو اس کے ایمان کو بصیرت والا ایمان بنائیں، جو اس کے اندر وہ صفت پیدا کرے، جس کو حدیث میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: أن يكون صَمْتي فِكْراً، ونُطْقي ذِكْراً، ونظري عبرة (جامع الاصول، حدیث نمبر 9317)۔ یعنی، میری خاموشی فکر کی خاموشی ہو، اور میرا بولنا ذکر کا بولنا ہو، اور میرا دیکھنا عبرت کا دیکھنا ہو۔ وہ درخت کو شاداب ہوتے ہوئے دیکھے تو اس کی زبان سے یہ دعا نکلے کہ خدایا مجھے آخرت میں اس طرح سرسبز وشاداب بنا دے۔

سیلف ڈسکورڈ معرفت

شمس مشرقی (وفات 1409ھ) فارسی زبان کے ایک شاعر تھے۔ ان کی ایک غزل کا یہ مصرع (line of verse) انسان کے سفر معرفت کی ترجمانی کرتا ہے:

خود کوزہ وخود کوزہ گر وخود گلِ کوزہ

یعنی خود ہی کوزہ ہے، خود ہی کوزہ بنانے والا اور خود ہی کوزہ کی مٹی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فرشتے ٹولڈ (told) معرفت پر کھڑے ہیں، وہ وہی جانتے ہیں، جو خدا نے ان کو بتا دیا ہے (البقرۃ، 2:32)۔ اس کے برعکس، انسان کو سیلف ڈسکوری کے ذریعے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ اصحابِ رسول کے یہاں طریقہ تھا کہ وہ اپنے ایمان ومعرفت میں اضافہ کے لیے ایک دوسرے سے کہا کرتے تھے: تَعَالَ نُؤْمِنْ بِرَبِّنَا سَاعَةً (مسند احمد، حدیث نمبر 13796)۔ یعنی، آؤ کچھ دیر کے لیے ہم اپنے رب پر ایمان لائیں۔ اور پھر وہ بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کی آیات میں غور وفکر کرتے تھے۔

اصل یہ ہے کہ دوسری مخلوقات اپنی مقرر کردہ جبلت (instinct) کے تحت عمل کرتی ہے۔ صرف انسان کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ اپنے ذاتی ارادے کے تحت سوچتا ہے اور کامل آزادی کے ساتھ اپنی زندگی کا نقشہ بناتا ہے۔ یہ صلاحیت صرف انسان کو دی گئی ہے، کیوں کہ خدا نے انسان کو چوائس (choice) کا مکمل اختیار دیا ہے۔ انسان کی اس خصوصیت کو ایک حدیث رسول میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: قیامت کے دن انسان سے بڑھ کر اللہ کے نزدیک کوئی بھی عزت والا نہ ہوگا (مَا مِنْ شَيْءٍ أَكْرَمُ عَلَى اللهِ مِنِ ابْنِ آدَمَ)۔ کہا گیا: اے اللہ کے رسول، فرشتے بھی نہیں۔ آپ نے کہا: فرشتے بھی نہیں۔ فرشتے مجبور ہیں، سورج اور چاند کی طرح (شعب الایمان للبیہقی، حدیث نمبر 151)۔

قرآن میں بتایا گیا ہے: ہم نے آدم کی اولاد کو عزت دی اور ہم نے ان کو خشکی اور تری میں سوار کیا، اور ان کو پاکیزہ چیزوں کا رزق دیا اور ہم نے ان کو اپنی بہت سی مخلوقات پر فوقیت دی (17:70)۔ انسان کی تکریم کا مطلب ہے کہ انسان کو سیلف ڈسکورڈ معرفت کی صلاحیت دی گئی ہے۔ یعنی جس طرح انسان اپنی عقل استعمال کرکے خشکی اور سمندر اور کائنات کو ڈسکور کرتا ہے، اور اس سے اپنے مادی فوائد حاصل کرتا ہے، اسی طرح اس کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنی عقل کو استعمال کرکے کائنات کی نشانیوں کے ذریعہ خدا کی معرفت حاصل کرے۔

تفکیرِ صحیح کا اصول

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے کچھ چیزوں کو تمہارے اوپر فرض کیا ہے، تم ان کو ضائع نہ کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، تم ان کا ارتکاب نہ کرو۔ اللہ نے کچھ حدود مقرر کیے ہیں، تم ان سے تجاوز نہ کرو۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ: وَسَكَتَ عَنْ أَشْيَاءَ مِنْ غَيْرِ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوا عَنْهَا (سنن الدارقطنی، حدیث نمبر 4396)۔ یعنی، کچھ چیزوں کے بارے میں اللہ نے سکوت فرمایا ہے، بغیر بھولے ہوئے، تم ان کے بارے میں بحث نہ کرو۔

اس حدیث کے آخری حصے میں جو بات کہی گئی ہے، اس کا مطلب دوسرے الفاظ میں یہ ہے کہ متعلق (relevant) اور غیر متعلق (irrelevant) کے درمیان فرق کرنا سیکھو۔ تمہاری بحث و تحقیق متعلق پہلو کے بارے میں ہونا چاہیے، غیر متعلق پہلوؤں کے بارے میں بحث و تحقیق کرنا صرف ہلاکت کا سبب بنتا ہے۔ اس کا نتیجہ فکری انتشار کے سوا اور کچھ نہیں۔

مثلاً قرآن کی پہلی آیت یہ ہے: اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (1:2)۔ اس آیت کا ایک پہلو یہ ہے کہ اللہ کی حمد اور اللہ کی نعمتوں پر غور کیا جائے۔ یہ اس کا متعلق پہلو ہے۔ اس پہلو پر غور کرنے سے ایمان میں اضافہ ہوگا۔ اس کے بجائے اگر اللہ کی ذات پر بحث کی جائے تو اس قسم کی بحث ایک غیر متعلق بحث ہوگی، وہ آدمی کو صرف کنفیوزن (confusion) تک پہنچائے گی۔

غور وفکر ہمیشہ ڈیٹا (data) کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ اللہ کی حمد پر غور کرنے کے لیے ہمارے پاس تخلیق کی شکل میں ڈیٹا موجود ہے، لیکن اللہ کی ذات پر غور کرنے کے لیے ہمارے پاس ڈیٹا موجود نہیں۔ اس لیے پہلی قسم کی بحث آدمی کو یقین تک پہنچائے گی اور دوسری قسم کی بحث صرف کنفیوزن تک۔ یہ تفکیرِ صحیح (right thinking) کا اہم ترین اصول ہے۔

تلاش حق

قرآن کی سورہ الضحیٰ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے:
وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدٰى (93:7) یعنی خدا نے تم کو متلاشی پایا تو اس نے تم کو راہ دکھائی:

Did God not find you wandering, and give you guidance ?

قرآن کی اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے، وہ صرف ایک مخصوص فرد کی بات نہیں، بلکہ وہ ہر انسان کی بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر انسان پیدائشی طور پر متلاشی (seeker) ہوتا ہے۔ اگر انسان اپنی فطرت کو اس کی ابتدائی حالت پر محفوظ رکھے تو ہر انسان حق کا متلاشی ہوگا، اور اپنی فطرت کے زور پر سچائی تک پہنچ جائے گا۔ حق انسان کے لیے کوئی اجنبی چیز نہیں، وہ ہر انسان کی اپنی فطرت کی آواز ہے۔ لیکن عملاً یہ ہوتا ہے کہ پیدا ہونے کے بعد انسان ایک خارجی ماحول میں زندگی گزارتا ہے۔ یہ خارجی ماحول ہر ایک انسان کو متاثر کرتا رہتا ہے۔ یہ عمل مسلسل طور پر جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ انسان کی فطرت خارجی اثرات سے مکمل طور پر ڈھک جاتی ہے۔ انسان کا حال یہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی فطرت کی روشنی میں سوچنے کے بجائے خارجی اثرات کے تحت سوچنے لگتا ہے۔ اس عمل کا نام کنڈیشننگ (conditioning) ہے۔

ایسی حالت میں ہر انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی عقل کو استعمال کرکے اس معاملے کو سمجھے۔ وہ محاسبہ (introspection) کے ذریعے اپنی ڈی کنڈیشننگ کرے۔ وہ اپنے آپ کو دوبارہ مسٹر کنڈیشنڈ (Mr. Conditioned) سے مسٹر نیچر (Mr. Nature) بنائے۔ ایسا کرنے کے بعد ہی آدمی اس رہنمائی سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، جو اللہ نے اس کے لیے اپنی کتاب اور رسول کی سنت کی صورت میں مہیا فرمائی ہے۔ جو آدمی اپنے آپ پر یہ عمل جاری کرنے کے لیے تیار نہ ہو، اس کو کبھی ہدایت کی توفیق نہیں مل سکتی۔ ہدایت کا تعلق اولاً اپنی ذات سے ہے اور اس کے بعد خارجی رہنمائی سے۔

شیطان کا چیلنج

انسانی تاریخ کے آغاز میں شیطان نے اللہ رب العالمین کے سامنے انسان کے تعلق سے ایک چیلنج کیا تھا۔ قرآن کے الفاظ میں وہ چیلنج یہ تھا: لَئِنْ أَخَّرْتَنِ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَأَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهُ إِلَّا قَلِيلًا (17:62)۔ یعنی، اگر تو مجھ کو قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں تھوڑے لوگوں کے سوا اس کی تمام اولاد کو قابو میں کرلوں گا۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کا یہ چیلنج کنڈیشننگ کا چیلنج ہے۔ یعنی انسان کو کنڈیشننگ میں مبتلا کرنا۔ کنڈیشننگ بلاشبہ ہر انسان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ کنڈیشننگ کا نقصان یہ ہے کہ آدمی ذہنی جمود (intellectual stagnation) کا شکار ہوجاتا ہے۔ وہ چیزوں کو ایز اٹ از (as it is) دیکھ نہیں پاتا۔ انسان کی یہ کمزوری ہے کہ وہ اپنی کنڈیشننگ کو توڑ کر سوچ نہیں پاتا۔ حقیقت کے اعتبار سے وہ کنڈیشننگ میں جیتا ہے، لیکن بطور خود یہ سمجھتا ہے کہ میں ایک ثابت شدہ حقیقت پر جی رہا ہوں۔ یہ خود فریبی انسان کے لیے سچائی کو اختیار کرنے میں ہمیشہ سب سے بڑی رکاوٹ ثابت ہوئی ہے۔

اس کے مقابلے میں ڈی کنڈیشنڈ آدمی حالات سے اوپر اٹھ کر سوچتا ہے۔ اس بنیاد پر وہ سچائی کو اس کی درست شکل میں دیکھتا ہے، اور اس کو قبول کرلیتا ہے۔ ہر آدمی کی یہ ایک اہم ذمے داری ہے کہ وہ اپنی کنڈیشننگ کو دریافت کرے، اور وہ سیلف ہیمرنگ کے ذریعے اپنے آپ کو کنڈیشننگ سے فری انسان بنائے۔

کنڈیشنڈ فری انسان کا بیان قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے: إِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طَائِفٌ مِنَ الشَّيْطَانِ تَذَكَّرُوا فَإِذَا هُمْ مُبْصِرُونَ (7:201)۔ یعنی جو لوگ ڈر رکھتے ہیں جب کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال انھیں چھو جاتا ہے تو وہ فوراً چونک پڑتے ہیں اور پھر اسی وقت ان کو سوجھ آجاتی ہے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان کنڈیشننگ سے پاک ہوتا ہے تو شیطان کے فریب (delusion) کو وہ فوراً سمجھ جاتا ہے۔ اس طرح وہ اس سے بچ جاتا ہے کہ حق کو ناحق کے روپ میں دیکھے، اور ناحق کو حق کے روپ میں۔

خدا کا خوف

اسلام میں خوفِ خدا کا تصور ایک مثبت تصور (positive concept) ہے۔ یہ خوف برائے خوف نہیں ہے، یہ خوف برائے ڈی کنڈیشننگ (de-conditioning) ہے۔ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ اپنے حالات کی بنا پر کامل طور پر کنڈیشننگ (conditioning) کا کیس بن جاتا ہے۔ اس کنڈیشننگ کو توڑنے کے لیے ایک طاقتور محرک (strong incentive) درکار ہے، اور اس قسم کا طاقتور محرک خدا کے خوف کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ خوفِ خدا کا مسئلہ صرف موجودہ دنیا کے لیے ہے، آخرت کے لیے نہیں۔ آخرت میں جنت میں وہی شخص جائے گا جس کی کنڈیشننگ مکمل طور پر ٹوٹ چکی ہوگی۔ اس لیے جنت میں خوف کے لیے کوئی جگہ نہیں (فاطر، 35:34)۔

ہر آدمی کی پرورش ایک ماحول میں ہوتی ہے۔ آدمی روزانہ ایسے ماحول سے اثر قبول کرتا ہے، یہاں تک کہ مکمل طور پر ایک متاثر ذہن (conditioned mind) بن جاتا ہے۔ اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ آدمی اپنے اس ذہن کو بدلے اور فطری حالت پر اپنے آپ کو قائم کرے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کو قرآن کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے: قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ فَرَبُّكُمْ أَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ أَهْدَىٰ سَبِيلًا (17:84)۔ یعنی کہو کہ ہر ایک اپنے طریقہ پر عمل کر رہا ہے۔ اب تمہارا رب ہی بہتر جانتا ہے کہ کون زیادہ ٹھیک راستہ پر ہے۔ قرآن کی اس آیت میں شاکلہ سے مراد وہی چیز ہے جس کو آج کل کی زبان میں مائنڈ سیٹ (mindset) کہا جاتا ہے۔ ہر پیدا ہونے والا آدمی اپنے حالات کے زیر اثر غیر ربانی شاکلہ میں جینے لگتا ہے۔ صحیح آدمی وہ ہے جو اس حقیقت کو جانے اور محاسبہ کے ذریعے اپنے آپ کو ربانی شاکلہ پر قائم کرے۔

محاسبۂ خویش (self introspection) کا یہ عمل ایک نہایت مشکل عمل ہے۔ اس عمل کے لیے نہایت طاقتور محرک درکار ہے۔ خوفِ خدا کے ذریعے یہی محرک انسان کے اندر پیدا ہوتا ہے۔ خوفِ خدا کے سوا کوئی اور چیز اس عمل کا محرک نہیں بن سکتی۔

ذکر کی عظمت

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں:

قَالَ مُعَاذٌ: قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم: أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِخَيْرِ أَعْمَالِكُمْ، وَأَزْكَاهَا عِنْدَ مَلِيكِكُمْ، وَأَرْفَعِهَا فِي دَرَجَاتِكُمْ وَخَيْرٍ لَكُمْ مِنْ تَعَاطِي الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، وَمِنْ أَنْ تَلْقَوْا عَدُوَّكُمْ غَدًا، فَتَضْرِبُوا أَعْنَاقَهُمْ وَيَضْرِبُوا أَعْنَاقَكُمْ. قَالُوا: بَلَى يَا رَسُولَ اللّٰہِ. قَالَ: ذِكْرُ اللّٰہِ (مسند احمد، حدیث نمبر 22079)۔ یعنی، معاذ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تم کو نہ بتاؤں کہ تمہارا سب سے اچھا عمل کیا ہے؟ جو تمہارے رب کے نزدیک سب سے زیادہ پاکیزہ عمل ہے، جو تمہارے درجات کو سب سے زیادہ بلند کرنے والا ہے، اور تمہارے لیے سونے چاندی کے صدقے سے بہتر ہے، اور اس سے بھی بہتر کہ تم اپنے دشمن کا سامنا کرو، تو تم ان کی گردنیں کاٹو اور وہ تمہاری گردنیں کاٹیں؟ صحابہ کرام نے کہا: ہاں، اے خدا کے رسول۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ کا ذکر۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا نشانہ کسی سیاسی نظام کو بدلنا نہیں بلکہ اس کا نشانہ فرد کی تعمیر ہے۔ اگر سیاسی نظام کو بدلنا اسلام کا نشانہ ہو تو قتال ایک لازمی ضرورت بن جاتا ہے، لیکن جب اصل نشانہ فرد کی سوچ کو بدلنا ہو تو اس کے لیے قتال کی کوئی ضرورت نہیں۔ سیاسی نظام کو بدلنے کی راہ میں سب سے پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ قابض حکمراں سے لڑ کر اس کو ہٹایا جائے۔ اس کے برعکس، فرد کی تعمیر میں قتال ایک غیر متعلق چیز بن جاتا ہے۔ فرد کی تعمیر ہمیشہ پرامن نصیحت کے ذریعے ہوتی ہے، نہ کہ متشددانہ ٹکراؤ کے ذریعے۔

ذکر سے مراد صرف زبانی ورد نہیں ہے، ذکر سے مراد وہی چیز ہے جس کے لیے قرآن میں تدبر اور تفکر کے الفاظ آئے ہیں۔ ذکر کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اللہ کی آیات پر غور کرے، یہاں تک خدا کی یاد اس کے ذہنی تفکیر (thinking) کا لازمی حصہ بن جائے۔ یہ عمل اس بات کا ضامن ہے کہ اس کے اندر اعلیٰ ربانی کیفیات پیدا ہوں۔ اس کا ذہنی ارتقا مسلسل طور پر جاری رہے، اس کی روحانی زندگی کبھی تعطل کا شکار نہ ہو۔

صحابہ اور تابعین

اسلام میں اسوہ کی حیثیت درجہ بدرجہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو حاصل ہے۔ قرآن میں آیا ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (33:21)۔ یعنی، تمہارے لیے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے۔

اس آیت کے مطابق، اسلام میں اصل اسوہ (ماڈل) صرف پیغمبر کا ہے۔ اس کے بعد دوسرا درجہ اصحاب رسول کا ہے، یعنی وہ مسلمان جو رسول اللہ کے ہم عصر تھے، اور جنھوں نے براہ راست پیغمبر اسلام سے تربیت حاصل کی۔ اس سلسلہ میں قرآن کی ایک رہنمائی یہ ہے: اگر وہ ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو بیشک وہ راہ پا گئے (2:137)۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہ صحابہ کرام جس ڈھنگ پر ایمان لائے تھے وہی وہ ایمان ہے جو اللہ کے یہاں اصلاً معتبر ہے۔

اس کے بعد تیسرا درجہ تابعین کا ہے، یعنی وہ گروہ جن کو پیغمبر کے تربیت یافتہ لوگوں کی صحبت حاصل ہوئی۔ حدیث کے مطابق، تابعین کا گروہ بھی اصحابِ خیر میں شامل ہے (صحیح البخاری، حدیث نمبر 2651، صحیح مسلم، حدیث نمبر 2534)۔ ان تینوں کے بعد کسی کو مستقل طور پر معیاری ماڈل کے اعتبار سے درجہ حاصل نہیں۔ بعد کے زمانے میں جو درجات مقرر کیے گئے ہیں، وہ سب مبتدعانہ اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کو دوبارہ قرآن وحدیث کے معیار پر جانچا جائے گا۔

بعد کے زمانے میں لوگوں نے اس میں ایک اور گروہ کا اضافہ کیا، اور وہ ہے تبع تابعین کا گروہ۔ مگر یہ ایک اجتہادی اضافہ ہے، وہ براہ راست قرآن وسنت سے اخذ کردہ اضافہ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین کے بعد تمام اہل ایمان یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ بعد کے لوگوں کو مطلق معنی میں اسوہ (ماڈل) کی حیثیت حاصل نہیں۔ بعد کے لوگوں کو براہ راست طور پر قرآن وحدیث سے جانچا جائے گا، نہ کہ زمانۂ نبوت سے قربت کی بنا پر۔

اسوہ بمعنی ماڈل کا مطلب یہ ہے کہ قابلِ پیروی ماڈل۔ یعنی ایک شخص کسی طریقے پر عمل کرنا چاہے، اور اس کے پاس رسول اور اصحابِ رسول کا ثابت شدہ نمونہ موجود ہو، تو اس کو چاہیے کہ وہ اس نمونہ کی روشنی میں اپنے عمل کو انجام دے۔

صحابہ کی احتیاط

ایک روایت حدیث کی مختلف کتابوں میں آئی ہے، صحیح البخاری کے الفاظ یہ ہیں: عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الزُّبَيْرِ، قَالَ: قُلْتُ لِلزُّبَيْرِ: إِنِّي لاَ أَسْمَعُكَ تُحَدِّثُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَمَا يُحَدِّثُ فُلاَنٌ وَفُلاَنٌ؟ قَالَ: أَمَا إِنِّي لَمْ أُفَارِقْهُ، وَلَكِنْ سَمِعْتُهُ يَقُولُ: مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 107)۔ یعنی، عبد اللہ بن زبیر نے اپنے باپ زبیر سے کہا، میں آپ کو نہیں سنتا کہ آپ رسول اللہ سے اس طرح بیان کرتے جیسا کہ فلاں اور فلاں بیان کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا: میں کبھی رسول اللہ سے جدا نہیں ہوا۔ لیکن میں نے آپ کو کہتے ہوئے سنا کہ جس نے مجھ پر جھوٹ باندھا تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنا لے۔

اس حدیث میں جس چیز کی وعید آئی ہے وہ رسول اللہ کی طرف جھوٹی بات منسوب کرنا ہے۔ جو آدمی اپنے علم کے مطابق سچی بات کو رسول اللہ کی طرف منسوب کرے، اس کی اللہ کے ہاں کوئی پکڑ نہیں۔ پکڑ اس انسان کے لیے ہے، جو بالقصد خلاف واقعہ بات کو رسول اللہ کی طرف منسوب کرے۔ بالفرض اگر نقلِ روایت میں کوئی غلطی ہوجائے تو اس کی کوئی پکڑ اللہ کے پاس نہیں ہے۔ کیوں کہ پکڑ نیت پر ہے۔ اگر آدمی کی نیت درست ہے تو ضرور اس کو حق بات پھیلانا چاہیے۔

جن اصحاب نے ایسا کیا، بظاہر انھوں نے احتیاط کی بنا پر کیا۔ لیکن میرے نزدیک یہ اجتہادی خطا کا معاملہ ہے۔ اس لیے کہ ایک صحابی کے پاس رسول اللہ کی ایک بات ہے، اور اس نے اس کو قولِ رسول کی حیثیت سے نہیں بتایا، اور اسی حالت میں وہ دنیا سے چلے گئے۔ تو ان کا کیس اجتہادی خطا کا کیس کہلائے گا۔ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر تمام صحابہ کو واضح الفاظ میں یہ تلقین کی تھی: فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الغَائِبَ، فَرُبَّ مُبَلَّغٍ أَوْعَى مِنْ سَامِعٍ (صحیح البخاری، حدیث نمبر 1741)۔ یعنی، تم میں سے جو حاضر ہے وہ غائب کو پہنچا دے۔ ہوسکتا ہے کہ جن کو پہنچایا جا رہا ہو، وہ سننے والے سے زیادہ سمجھنے والا ہو۔

ایک قرآنی پیشین گوئی

قرآن کی سورہ النحل میں ارشاد ہوا ہے: ”اور اللہ نے چوپایوں کو بنایا۔ ان میں تمہارے لیے پوشاک بھی ہے اور خوراک بھی اور دوسرے فائدے بھی، اور تم ان میں سے کھاتے بھی ہو۔ اور ان میں تمہارے لیے رونق ہے جب کہ شام کے وقت تم ان کو لاتے ہو اور جب صبح کے وقت تم ان کو چھوڑتے ہو۔ اور وہ تمہارے بوجھ ایسے مقامات تک پہنچاتے ہیں جہاں تم سخت محنت کے بغیر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ بے شک تمہارا رب بڑا شفیق، مہربان ہے۔ اور اس نے گھوڑے اور خچر اور گدھے پیدا کیے، تاکہ تم ان پر سوار ہو اور زینت کے لیے بھی، اور وہ ایسی چیزیں پیدا کرتا ہے جو تم نہیں جانتے ”وَیَخۡلُقُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ“ (16:5-8)۔

یہاں جس سیاق (context) میں وَیَخۡلُقُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ (اور وہ ایسی چیزیں پیدا کرتا ہے جو تم نہیں جانتے) کے الفاظ آئے ہیں، اس پر غور کرنے سے ایک اہم حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ سیاق کی نسبت سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے نقل و حمل کے لیے معلوم حیوانات کے علاوہ کچھ اور چیزیں امکانی طور پر پیدا کی ہیں، جن کا علم تم مستقبل میں حاصل کروگے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی اس آیت میں ایک پیشین گوئی کی گئی ہے۔ وہ یہ کہ قرآن کے نزول کے وقت ٹرانسپورٹ اور کمیونی کیشن کے لیے انسان کے پاس صرف حیوانی ذرائع ہیں، لیکن بعد کو فطرت (nature) میں کچھ ایسی چیزیں دریافت ہوں گی جس کے بعد ٹرانسپورٹ اور کمیونی کیشن کے مشینی ذرائع انسان کی دسترس میں آجائیں گے۔ اس آیت میں دراصل بعد کو آنے والے اس دور کی پیشین گوئی ہے جس کو موجودہ زمانے میں کمیونی کیشن کا دور (age of communication) کہا جاتا ہے۔

انسانی تاریخ کا حیوانی نقل و حمل کے دور سے نکل کر مشینی نقل و حمل کے دور میں پہنچنا بلاشبہ ایک عظیم واقعہ ہے۔ اس واقعے نے نہ صرف انسان کے لیے سفری سہولیات کا ایک نیا دروازہ کھول دیا ہے، بلکہ اس نے اسی کے ساتھ دین خداوندی کے لیے نئے امکانات بھی پیدا کردیے ہیں۔ اس کا تقاضا ہے کہ اہل ایمان نہ صرف شکر عظیم کا ثبوت دیں، بلکہ وہ عالمی سطح پر منصوبۂ تخلیق سے آگاہی کا فریضہ بھی انجام دیں۔

صحت فکر

ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے گفتگو کے دوران کنفیوزن کا ذکر کیا۔ میں نے کہا کہ یہ ایک بے حد اہم مسئلہ ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ 99 فیصد سے زیادہ لوگ کنفیوزڈ تھنکنگ (confused thinking) میں مبتلا رہتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں وہ اس نعمت سے محروم ہوجاتے ہیں جس کو رائٹ تھنکنگ (right thinking) کہا جاتا ہے۔

لوگوں کے اندر سب سے زیادہ کمی یہی ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ صحیح طرزِ فکر کیا ہے اور غلط طرزِ فکر کیا۔ اِسی کا یہ نتیجہ ہے کہ عام طور پر لوگ شکایت کی نفسیات میں جیتے ہیں۔ وہ اپنی غلط سوچ اور اپنے غلط عمل کی قیمت ادا کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ دوسرے لوگوں کی سازش اور ظلم کی بنا پر ایسا ہورہا ہے۔ اِسی بنا پر لوگوں کا یہ حال ہے کہ جہاں چپ رہنا چاہیے، وہاں وہ بولتے ہیں۔ جہاں اقدام نہ کرنا چاہیے، وہاں وہ چھلانگ لگا دیتے ہیں۔ جہاں ایڈجسٹ کرنا چاہیے، وہاں وہ لڑنے کے لیے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ جن لوگوں سے دوستانہ تعلق قائم کرنا چاہیے، اُن کو وہ اپنا دشمن سمجھ کر اُن سے دور ہوجاتے ہیں۔ وہ خود ساختہ طور پر دوسروں کو اپنا ''غیر'' سمجھ لیتے ہیں۔ حالاں کہ اِس دنیا میں ہر شخص اپنا ہے، کوئی بھی کسی کے لیے غیر نہیں۔ اِسی بنا پر لوگ صبر وتحمل کی اہمیت کو نہیں سمجھتے، حالاں کہ اِس دنیا میں کامیابی کا سب سے زیادہ کارگر فارمولا وہی ہے جس کو صبر وتحمل کہا جاتا ہے۔

رائٹ تھنکنگ دراصل سدادِ فکر (sound thinking) کا دوسرا نام ہے۔ انسان کو چاہیے کہ سب سے پہلے وہ آرٹ آف تھنکنگ میں مہارت حاصل کرے۔ اس کے بغیر اس کی پوری زندگی بے معنی ہوکر رہ جائے گی، فکری اعتبار سے بھی اور عملی اعتبار سے بھی۔ انسانی سماج میں ہر قسم کے بگاڑ کا تعلق سوچ سے ہے۔ اصلاح کا راز یہ ہے کہ انسانی سوچ میں تبدیلی لائی جائے۔ انسانی سوچ کو بدلے بغیر کوئی بھی اصلاح ممکن نہیں۔ اس حقیقت کو انٹلکچول ایمپاورمینٹ (intellectual empowerment) کا نام دیا جاسکتا ہے۔ یعنی لوگوں کو فکری طاقت دینا، اُن کے اندر معاملہ فہمی کی صلاحیت پیدا کرنا، ان کو

اِس قابل بنانا کہ وہ ایک چیز اور دوسری چیز کے فرق کو سمجھیں، وہ درست منصوبہ بندی کے ساتھ اپنا کام کریں۔

انسان کے اندر فکری اصلاح کا عمل (process) مسلسل اور درست انداز میں کیوں جاری نہیں رہتا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسان معلومات کے جنگل کے درمیان زندگی گزارتا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس کے اندر وہ فکری استعداد موجود ہو جس کے ذریعے وہ متعلق (relevant) اور غیر متعلق (irrelevant) کے فرق کو جانے۔ وہ غیر متعلق باتوں کو چھوڑتے ہوئے متعلق باتوں پر اپنی نظر جمائے رہے۔ یہی وہ واحد آرٹ ہے جو انسان کے لیے صحت فکر کا ضامن ہے۔

نجات کیا ہے

نجات کے معاملے میں ایک حدیث رسول ان الفاظ میں آئی ہے: عَنْ عُقْبَةَ بْنِ عَامِرٍ، قَالَ: قُلْتُ: يَا رَسُولَ اللّٰهِ مَا النَّجَاةُ؟ قَالَ: امْلِكْ عَلَيْكَ لِسَانَكَ، وَلْيَسَعْكَ بَيْتُكَ، وَابْكِ عَلَى خَطِيئَتِكَ (سنن الترمذی، حدیث نمبر 2406)۔ یعنی ابو امامہ سے روایت ہے، عقبہ بن عامر نے رسول اللہ سے پوچھا، اے اللہ کے رسول، نجات کیا ہے۔ آپ نے جواب دیا، اپنی زبان پر کنٹرول کرو، تمھارا گھر تمھارے لیے کافی ہو، اور اپنی غلطی پر روؤ۔

اس حدیث رسول پر غور کیجیے۔ بظاہر اس میں تین باتیں کہی گئی ہیں — اپنی زبان پر قابو رکھو، اور دنیا کی طلب کو آخری حد تک کم کرو، اور زیادہ سے زیادہ اپنا احتساب کرو۔ ان تینوں باتوں کا خلاصہ کریں تو یہ ہوگا کہ زیادہ سے زیادہ اللہ کو یاد کرو۔ یہ تینوں صفتیں دراصل اللہ کی معرفت کا نتیجہ ہیں۔

اللہ کی معرفت انسان کے لیے ماسٹر اسٹروک (master stroke) کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ماسٹر اسٹروک کیرم (carrom) کی اصطلاح ہے۔ ماسٹر اسٹروک اس اسٹروک کو کہتے ہیں، جو کھیل کے تمام گوٹوں کو ہلا دے۔ اسی طرح معرفتِ الٰہی اگر انسان کے اندر حقیقی طور پر پیدا ہو جائے تو اس کی پوری شخصیت ہل جائے گی، وہ ہر اعتبار سے اللہ کے رنگ میں رنگ جائے گا (البقرۃ، 2:138)۔ اس کی شخصیت پوری طرح ایک ربانی شخصیت بن جائے گی۔

تنگی کا جینا

قرآن کی چند آیتیں یہ ہیں: وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكاً وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيامَةِ أَعْمى۔ قالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيراً ۔قالَ كَذلِكَ أَتَتْكَ آياتُنا فَنَسِيتَها وَكَذلِكَ الْيَوْمَ تُنْسى (20:124-126)۔یعنی، جوشخص میرے ذکر سے اعراض کرے گا تو اس کے لیے تنگی کا جینا ہوگا۔ اور قیامت کے دن ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا کہ اے میرے رب، تو نے مجھ کو اندھا کیوں اٹھایا، ارشاد ہوگا کہ اسی طرح تمہارے پاس ہماری نشانیاں آئیں تو تم نے ان کو بھلا دیا، تو اس طرح آج تم کو بھلا دیا جائے گا۔

قرآن کی اس آیت میں ’ذکر کے اعراض‘ کا مطلب وہی ہے جس کو آگے ’آیات یعنی نشانیوں سے اعراض‘ کے الفاظ میں بیان کیا۔ دنیا کی زندگی میں انسان کے سامنے ہر وقت طرح طرح کی نشانیاں آتی رہی ہیں۔ یہ نشانیاں اس لیے آتی ہیں، تاکہ انسان ان پر سوچے اور ان سے نصیحت حاصل کرے۔ یہ سوچنا اور نصیحت حاصل کرنا وہ چیز ہے جس سے آدمی کو سچائی کی معرفت حاصل ہوتی ہے، جس سے آدمی اپنی زندگی کی معنویت سمجھتا ہے اور اپنے قول وعمل کے بارے میں درست طریقہ اختیار کرتا ہے۔ مگر جب آدمی ذکر سے اعراض کرے تو وہ درست رویہ اختیار کرنے سے محروم رہ جائے گا۔

’معیشۃً ضنکاً، سے مراد رزق کی تنگی نہیں ہے، بلکہ فکر کی تنگی ہے۔ یعنی وہ صورت حال جب کہ آدمی کا ذہن کھلا ہوا نہ ہو، وہ تعصب اور تنگ نظری جیسی منفی صفات کا شکار ہو۔ ایسا آدمی ذہنی فاقہ (intellectual starvation) میں مبتلا رہے گا۔ وہ چیزوں کو دیکھے گا، مگر وہ اس سے نصیحت نہ لے سکے گا۔ وہ باتوں کو سنے گا، لیکن اس سے وہ کوئی روحانی غذا (spiritual food) حاصل نہ کر سکے گا۔ اس کو تجربات پیش آئیں گے، لیکن تجربات کو ایک متوسم (الحجر، 15:75) کی نظر سے دیکھنا اس کے لیے ممکن نہ ہوگا، وغیرہ۔ یہی مطلب ہے اس آیت میں ’معیشتِ ضنک‘ کا۔

مستقبل کی طرف

قرآن کی سورہ البقرہ میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں ہر فرد اور ہر گروہ کو لازماً کوئی نہ کوئی نقصان پیش آتا ہے (2:155)۔ اس حالت میں انسان کو کیا کرنا چاہیے۔ یہ رہنمائی اگلی آیت میں ان الفاظ میں بیان کی گئی ہے: الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ (2:156)۔ یعنی، جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں ہم اللہ کے ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے نقصان کو خدا کے حوالے کر کے اپنے مستقبل کے لیے حقیقت پسندانہ بنیاد پر ازسرنو پلاننگ کی جائے۔ یہی سنت رسول ہے اور یہی فطرت کا قانون بھی۔

نبوت کے تیرھویں سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اہل مکہ کے ظلم کی بنا پر مکہ کو چھوڑنا پڑا۔ آپ نے اہل مکہ کے ظلم کو بھلا کر مدینہ میں اپنے مشن کی نئی منصوبہ بندی کی۔ غزوۂ احد (3 ہجری) میں 70 صحابہ شہید ہوئے اور بہت سے لوگ زخمی ہوئے۔ آپ نے دوبارہ یہی کیا کہ اس حادثے کو بھلا کر اپنے پیغمبرانہ مشن کی نئی تنظیم کی، وغیرہ۔

یہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک عظیم سنت ہے۔ تمام مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس سنت رسول کو دل سے قبول کریں اور اس کے مطابق اپنے عمل کا منصوبہ بنائیں۔ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے ساتھ ہر جگہ اس قسم کے نقصانات پیش آرہے ہیں۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ اس سنت رسول کو بھلائے ہوئے ہیں۔ وہ ماضی کی شکایتوں میں جی رہے ہیں اور مستقبل کے لیے نئی منصوبہ بندی سے غافل ہیں۔ یہ طریقہ سراسر غیر اسلامی طریقہ ہے۔ یہ طریقہ مسلمانوں کو ہرگز کوئی فائدہ دینے والا نہیں۔ وہ صرف ان کے نقصان میں مزید اضافے کا سبب بنتا رہے گا۔ اس معاملے میں مسلمانوں کے لیے ایک ہی راستہ ہے۔ یہ کہ وہ اپنی اس منفی روش کو بدلیں اور مثبت سوچ کے ساتھ اپنے عمل کی نئی منصوبہ بندی کریں۔ اس عمل میں تاخیر نقصانات میں مزید اضافے کے سوا مسلمانوں کو کچھ اور دینے والا نہیں۔ ماضی کی تلخ یادوں کو بھلانا ہی اس کا مسئلہ کا حل ہے۔ اس حکمت کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَى مَا فَاتَكُمْ (57:23)۔ یعنی، تاکہ تم اس پر غم نہ کرو جو تم سے کھویا گیا ہے۔

سازش بے اثر

سازش اپنے ابتدائی مرحلے میں ایک منفعل سوچ (passive thought) ہوتی ہے۔ لیکن جب آپ اس کے خلاف کوئی کارروائی کرکے اس کو اشتعال کے درجے میں پہنچا دیں تو اس وقت وہ فعال سوچ (active thought) بن جاتی ہے۔ سازش ابتدائی طور پر کوئی خطرناک بات نہیں ہوتی، لیکن جب نادانی کا طریقہ اختیار کرکے اس کو اشتعال کے مرحلے میں پہنچا دیا جائے تو اس کے بعد سازش آپ کے لیے مسئلہ بن جاتی ہے۔ اگر آپ اپنی طرف سے سازش کے لیے جواز (justification) فراہم نہ کریں تو سازش پوری طرح بے اثر بن کر رہ جائے گی۔ اسی لیے قرآن میں آیا ہے: وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا (3:120)۔ یعنی، اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کی کوئی تدبیر تم کو نقصان نہ پہنچا سکے گی۔

سازش ابتدائی طور پر ایک کمزور فعل ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سازش ہمیشہ دو طرفہ بنیاد پر چلتی ہے۔ یک طرفہ بنیاد پر سازش کا چلنا ممکن نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص آپ کے خلاف سازش کی بات سوچ سکتا ہے، لیکن سازش کو چلانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ اس کے جواب میں ردّ عمل کا کوئی فعل نہ کریں۔ جب آپ ایسا کریں تو سازش کرنے والے کو جواز مل جاتا ہے کہ وہ اپنی سازش کو آگے بڑھائے، اور اس کو آپ کے خلاف ایک موثر عمل بنا دے۔

مثلاً کچھ لوگوں نے یہ سازش کی کہ آپ کے اوپر کیچڑ پھینکے۔ تاکہ آپ غصہ ہو کر اس کو پتھر ماریں۔ اس کے بعد اس کو موقع مل جائے کہ وہ مزید کارروائی کرکے آپ کے خلاف لوگوں کو بھڑکائے، اور آپ کے خلاف ایک فضا قائم ہو جائے۔

سازش کا طریقہ ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔ سازش کرنے والا اس لیے سازش کرتا ہے کہ آپ بھڑک کر کوئی ایسا فعل کریں، جس کے بعد سازش کرنے والے کو آپ کے خلاف مزید تخریبی کارروائی کرنے کا موقع مل جائے۔ سازش کا آغاز دوسرے کے ہاتھ میں ہوتا ہے، لیکن سازش کو انجام تک پہنچانا، پوری طرح آپ کے ردعمل پر موقوف ہے۔

صبر کیا ہے

صبر ابتدائی طور پر اس بات کا نام ہے کہ کوئی ناخوشگوار صورت حال پیش آئے تو آدمی برداشت کرلے۔ آہ واویلا کرنے کے بجائے وہ تحمل کا طریقہ اختیار کرے۔ صبر یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو ری ایکشن (reaction) سے بچائے۔ اور ناخوشگوار صورتِ حال کو اندر ہی اندر سہہ لے۔ صبر اپنے وسیع تر مفہوم کے اعتبار سے پیس فل پلاننگ کا نام ہے۔ بے صبری یہ ہے کہ آدمی ری ایکشن کا طریقہ اختیار کرے، اور صبر یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو آخری حد تک ری ایکشن سے بچائے۔ بلکہ خاموش انداز سے پر امن تدبیر کے ذریعے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرے۔

صبر کا معاملہ اجتماعی زندگی میں جب بھی پیش آئے، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ٹکراؤ کو اوائڈ کیا جائے، اور وقتی طور پر کوئی تکلیف پیش آئے تو اس کو برداشت کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے آدمی معاملے پر غور وفکر کرے۔ پھر غیر جذباتی انداز میں خاموش پلاننگ کے ذریعے معاملے کو حل کرنے کی کوشش کی جائے۔

پیغمبر اسلام کی پوری زندگی اس طریقِ کار کی عملی مثال ہے۔ آپ کا زمانہ قبائلی دور (tribal age) تھا۔ اس زمانے میں لوگوں کو مسائل کا ایک ہی حل معلوم تھا۔ وہ تھا بذریعہ "تلوار" مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کرنا۔ اس کے برعکس، پیغمبر اسلام نے ہمیشہ اختلافی معاملات میں تحمل کا طریقہ اختیار کیا، اور پیس فل پلاننگ (خاموش منصوبہ بندی) کے ذریعے مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کی۔ آپ کی پوری زندگی، خواہ مکی دور ہو یا مدنی دور، اسی دانش مندانہ طریقِ کار کی کامیاب مثال ہے۔

مثلاً صلح حدیبیہ کے موقع پر اہل مکہ نے آپ کو مشتعل (provoke) کرنے کا ہر ممکن طریقہ اختیار کیا تھا۔ مگر رسول اللہ نے مکمل طور پر اعراض کا طریقہ اختیار کیا۔ اس کا ذکر قرآن میں ان الفاظ میں آیا ہے: جب انکار کرنے والوں نے اپنے دلوں میں حمیت پیدا کی، جاہلیت کی حمیت، پھر اللہ نے اپنی طرف سے سکینت نازل فرمائی اپنے رسول پر اور ایمان والوں پر، اور اللہ نے ان کو تقویٰ کی بات پر جمائے رکھا اور وہ اس کے زیادہ حق دار اور اس کے اہل تھے (48:26)۔ اس ناخوشگوار موقع پر آپ نے یک طرفہ طور پر صبر کا طریقہ اختیار کیا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ فتح مبین کی شکل میں برآمد ہوا (الفتح، 48:1)۔

شاک ٹریٹمنٹ

قرآن کی ایک آیت ان الفاظ میں آئی ہے:

إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (3:153)۔ یعنی، جب تم لوگ بھاگے جا رہے تھے اور مڑ کر بھی کسی کو نہ دیکھتے تھے، اور رسول تم کو تمہارے پیچھے سے پکار رہا تھا۔ پھر اللہ نے تم کو غم پر غم دیا تاکہ تم رنجیدہ نہ ہو اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے چوک گئی اور نہ اس مصیبت پر جو تم پر پڑے۔ اور اللہ باخبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔

یہ آیت غزوہ احد (3ھ) سے تعلق رکھتی ہے۔ اہل ایمان کو اس جنگ میں غم کا شدید تجربہ ہوا۔ اس وقت یہ تعلیم دی گئی کہ جب تمہارے ساتھ غم کا واقعہ پیش آئے اور تم کو کسی چیز کے کھونے کا تجربہ ہو تو تم اس پر رنج اور افسوس نہ کرو۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ صبر کی تعلیم ہے۔ اس وقت پیغمبر موجود تھا، اور قرآن اتر رہا تھا، تو لفظی تعلیم کافی تھی، پھر غم کا واقعہ کیوں پیش آیا۔

اس کا سبب یہ ہے کہ کھوئے جانے پر غم نہ کرنا، یہ کوئی سادہ بات نہیں ہے۔ کھوئے جانے پر غم نہ کرنا، اس وقت ہوتا ہے، جب کہ آدمی پر ایسے سخت تجربات گزریں، جو اس کی کنڈیشننگ کو توڑ کر اس کے اندر ڈی کنڈیشنڈ ذہن (deconditioned mind) پیدا کردیں۔ کنڈیشننگ سے خالی آدمی ہی یہ کرسکتا ہے کہ اس کو مادی قسم کا صدمہ پیش آئے، لیکن وہ غیر متاثر سوچ پر قائم رہے۔

یہ صفت ایک تربیت یافتہ ذہن کا ظاہرہ ہے، اور تربیت یافتہ ذہن صرف تجربات کے کورس سے گزرنے کے بعد تیار ہوتا ہے۔ غم کے واقعہ پر حزن اور مایوسی کا پیدا نہ ہونا ایک تربیت یافتہ انسان کی خصوصیت ہے۔ اگر اس بات کی صرف لفظی تعلیم دی جائے تو تربیت کا فائدہ حاصل نہیں ہوگا، اس لیے انسان کو صدمہ (shock) کے کورس سے گزارا جاتا ہے، تاکہ اس کی ڈی کنڈیشننگ ہو، اور نفسیاتی اعتبار سے وہ اعلیٰ صفت کا حامل بن سکے۔

سچا شکر

انسان کے لیے سب سے مشکل چیز اعتراف ہے۔ اعتراف کی حقیقت شکر گزاری ہے۔ یعنی دوسرے انسان سے جو چیز حاصل ہوئی ہے، اس کا اعتراف کرنا۔ انسان ہر ملی ہوئی چیز کو اپنی کوشش کا نتیجہ سمجھتا ہے، اس لیے وہ دوسرے کا اعتراف نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ جو چیز پائی جاتی ہے، وہ دوسروں کا عدم اعتراف ہے، اور سب سے کم جو چیز پائی جاتی ہے، وہ دوسروں کا اعتراف ہے، یعنی شکر اور ناشکری۔ انسان کا عُجب (pride) اس کے لیے مانع بن جاتا ہے کہ وہ دوسرے کا اعتراف کرے۔ یہی وجہ ہے کہ جس کو دیکھیے، وہ ناشکری کی بولی بولتا ہے۔ شکر کی بولی بولنے والا مشکل سے کوئی دنیا میں ملے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ سچا شکر ہمیشہ اپنی نفی کی قیمت پر ادا ہوتا ہے۔ چوں کہ بیشتر لوگ اپنی نفی کی قیمت دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے، اس لیے وہ شکر یا اعتراف بھی نہیں کرپاتے۔ جب آپ کسی کا اعتراف کرتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ ایک ملی ہوئی چیز کا کریڈٹ دوسرے شخص کو دیتے ہیں۔

آج آپ لوگوں کا سروے کریں، تو آپ پائیں گے کہ ہر آدمی شکایت کی بولی بولتا ہے۔ میں نے ذاتی طور پر بار بار اس حقیقت کا تجربہ کیا ہے۔ مثلاً کئی بار میں نے جلسہ عام میں لوگوں سے پوچھا کہ آپ کی معاشی زندگی کل کیسی تھی، اور آج کیسی ہے۔ تقریباً ہر ایک نے بتایا کہ اس کی معاشی زندگی پہلے کے مقابلے میں آج بہت بہتر ہے۔ مگر اس سے سماج کے عام حالت پر گفتگو کریں، تو وہ شکایت کرے گا، وہ شکر کی بولی نہیں بولے گا۔

مثلاً دلی میں ایک صاحب میرے آفس میں آئے۔ وہ نئی کار پر بیٹھ کر آئے تھے۔ ہمارے آفس میں آتے ہی وہ شکایت کی بولی بولنے لگے۔ میں نے جب ان کے ذاتی حالات پوچھے، تو ہر بات پر وہ الحمدللہ کہتے تھے۔ گویا اپنی ذات کے لیے ان کی زندگی الحمدللہ تھی، اور دوسروں کے لیے ان کے پاس شکایت کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ حقیقی زندگی وہی ہے، جو فرد اپنی سطح پر تجربہ کرتا ہے، نہ کہ وہ جو انسان کسی سے سنتا ہے۔

شکر کا ایک آئٹم

سائنسی مطالعے کے مطابق، تقریباً 13.8 بلین سال پہلے بگ بینگ (Big Bang) کے ذریعہ موجودہ دنیا کی تاریخ کا آغاز ہوا۔ یہ ستاروں اور کہکشاؤں سے بھری ہوئی ایک وسیع کائنات تھی۔ اس کائنات میں ملکی وے (Milky Way) کے اندر وہ دنیا تھی، جس کو ہم شمسی نظام (solar system) کے نام سے جانتے ہیں۔ اسی شمسی نظام کے ایک سیارہ پلانیٹ ارتھ پر انسان آباد ہے۔ یہ ایک پوری طرح کسٹم میڈ ورلڈ ہے۔ اسی بنا پر یہ ممکن ہوا کہ انسان اس زمین پر بہ سہولت آباد ہو، اور یہاں آزادی کے ساتھ اپنی ایک تہذیب (civilization) بنائے۔

اس قسم کی معلومات انسان کو سائنسی دور سے پہلے نہیں تھی۔ دور بین، خوردبین اور دوسری ایجادات نے انسان کو وہاں تک پہنچا دیا، جہاں انسان اس سے پہلے کبھی نہیں پہنچا تھا۔ پہلے تو انسان اللہ رب العالمین کو مانتا تھا، لیکن اس کا یہ علم مبنی بر حقائق نہیں تھا، بلکہ مبنی بر عقیدہ تھا۔

یہ اللہ کا انسان کے اوپر بہت بڑا احسان ہے کہ اس کو اللہ نے ریاضیاتی حساب کتاب (mathematical calculation) کی صلاحیت دی۔ اللہ نے آج کے انسان کو یہ صلاحیت عطا کی کہ وہ موجودات کو وہاں تک دیکھے، جہاں تک اس سے پہلے انسان نے کبھی دیکھا نہیں تھا۔ اس کی پہنچ عالم کبیر (macro world) سے لے کر عالَمِ صغیر (micro world) تک ہوگئی۔ اس طرح یہ ممکن ہوگیا کہ انسان اللہ کی ذات پر مزید گہرائی کے ساتھ یقین کرسکے۔ انسان بہت زیادہ شکر کی زندگی گزارے۔

قرآن میں پیغمبر موسیٰ کی ایک دعا بیان کی گئی ہے۔ اس دعا کا ایک جزء یہ ہے: كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيرًا ۔ وَنَذْكُرَكَ كَثِيرًا (20:33-34)۔ تاکہ ہم دونوں کثرت سے تیری پاکی بیان کریں۔ اور کثرت سے تیرا چرچا کریں۔ موجودہ دور میں سائنسی انکشافات کے ذریعہ ظاہر ہونے والی خدائی نشانیاں اس دعا کو پہلے سے کہیں زیادہ وسیع پیمانے پر ممکن بنا رہی ہیں۔ یہ بلاشبہ انسان کے اوپر اللہ کا بہت بڑا انعام ہے۔

فخر کی خوراک

بیسویں صدی کے ایک مشہور مسلم شاعر کا شعر ہے:

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے مشرق ومغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اس شعر کے پہلے مصرعے میں جو بات کہی گئی ہے، اس کا تقاضہ تھا کہ شاعر یہ کہتا کہ اب دنیا کے حالات بدل گئے ہیں۔ اب تم ان تبدیلیوں سے باخبر ہو جاؤ، اور اپنے عمل کی منصوبہ بندی نئے دور کے مطابق کرو۔ ورنہ تم آج کی دنیا میں بےجگہ (misfit) ہو جاؤ گے۔ مگر شاعر نے اس کے برعکس ایک ایسی بات کہہ دی جس سے مسلمانوں کو صرف فرضی فخر (false pride) کی خوراک ملے گی۔ اور کسی قوم کے لیے فرضی فخر سے زیادہ تباہ کن کوئی دوسری چیز نہیں۔

بیسویں صدی میں پرنٹنگ پریس آیا اور آزادی کا ماحول قائم ہوا۔ ان حالات میں مسلمانوں کے اندر اسلام کے نام پر بڑی بڑی تحریکیں اٹھیں۔ ان تمام تحریکوں کا مشترک پہلو یہ تھا کہ ہر ایک نے کسی نہ کسی اعتبار سے مسلمانوں کو فخر کی غذا دی۔ ہمارا دین سب سے افضل، ہمارا نبی سب سے افضل، ہمارا قرآن سب سے افضل، ہماری امت سب سے افضل، ہماری تاریخ سب سے افضل، ہمارا کلچر سب سے افضل، وغیرہ۔ یہی بیسویں صدی کی تمام مسلم تحریکوں کا مشترک خلاصہ تھا۔ مذہبی رہنما اور سیکولر رہنما دونوں یکساں طور پر اس میں شریک تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پوری مسلم امت، عرب سے عجم تک، فخر پسندی کے ذہن میں مبتلا ہو گئی۔

فخر کوئی سادہ بات نہیں۔ فخر سے برتری کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ اور برتری سے کبر (arrogance) کا مزاج، اور کبر تمام اعلیٰ انسانی اوصاف کا قاتل ہے۔ کبر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر دوسروں کے لیے خیر خواہی کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کبر سے تعلم (learning) کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ کبر سے ایڈجسٹمنٹ کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ کبر سے حقیقت پسندی کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے، وغیرہ۔ کبر ہر قسم کی مثبت صفات کا قاتل ہے۔ اور جس فرد یا قوم کے اندر مثبت صفات نہ ہوں وہ دنیا کے اعتبار سے بھی ناکام ہے اور آخرت کے اعتبار سے بھی ناکام۔

شادی شدہ زندگی

نکاح نام ہے، غیر آئڈیل زوج (spouse) کو رضامندی کے ساتھ قبول کرنے کا۔ اس لیے بالفرض اگر آپ کو اپنی پسند کا زوج مل جائے، تب بھی وہ آپ کے لیے کسی اعلیٰ دعا کا پوائنٹ آف ریفرنس نہیں بنے گا۔ آپ دونوں مل کر ہو ہا (hu ha) کریں گے، یعنی ہنسی مذاق۔ نہ آپ کچھ سیکھیں گے، اور نہ آپ کا زوج کچھ سیکھے گا۔ نہ آپ کے دل سے کوئی بڑی دعا نکلے گی، اور نہ آپ کے زوج کے دل سے کوئی بڑی دعا نکلے گی۔

اس کے برعکس، جب آپ یہ جانیں کہ دنیا میں اللہ نے کسی کے لیے پسندیدہ زوج پیدا ہی نہیں کیا۔ یہ دنیا محدودیت (limitation) کے اصول پر بنی ہے۔ مثلاً یہاں ہر دو انسان کے درمیان اختلافات (differences) ہیں، اور رہیں گے۔ اس لیے شادی شدہ زندگی نام ہے اختلاف کے باوجود کسی کو اپنا ساتھی بنانے کا، غیر آئڈیل ہونے کے باوجود کسی کو پسند کرنا۔ اکثر لوگ فطرت کے اس راز کو نہیں جانتے۔ اس لیے وہ پسندیدہ زوج کی تلاش میں رہتے ہیں، اور فطرت کے قانون کے مطابق، اس دنیا میں کسی کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ اپنی پسند کا زوج حاصل کرلے، ہر ایک کے اندر کوئی نہ کوئی کمی یقیناً رہے گی۔

فطرت کے نظام کے مطابق، جب آپ ناپسندیدہ زوج سے نکاح کریں، تو وہ آپ کی دعا کے لیے ایک اعلیٰ درجے کا پوائنٹ آف ریفرنس بن جائے گا۔ آپ کہیں گے کہ خدایا دنیا کی زندگی سماجی تعلقات کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ دنیا میں مَیں نے فطرت کے نظام کے مطابق، ایک زوج کو اپنے لیے قبول کرلیا۔ اب میری دعا ہے کہ تو آخرت میں میرے ساتھ پیغمبر کی دعا کے مطابق وہ معاملہ کر جو قرآن میں ان الفاظ میں مذکور ہے: رَبِّ إِنِّي لِمَا أَنْزَلْتَ إِلَيَّ مِنْ خَيْرٍ فَقِيرٌ (28:24)۔ یعنی، اے میرے رب، تو جو چیز میری طرف خیر میں سے اتارے، میں اس کا محتاج ہوں۔

جس انسان کے لیے اس کی شادی اس قسم کی دعا کے لیے پوائنٹ آف ریفرنس بن جائے، اسی کی شادی، شادی ہے۔ اس کے علاوہ شادی کی جو قسمیں ہیں، ایسی شادی اپنی نوعیت کے اعتبار سے حیوانی تعلقات کا معاملہ ہے، یعنی حیوان کی طرح زندگی گزارنا، اور اس دنیا سے اپنا مقصد حیات جانے بغیر چلے جانا۔

دنیا کی شادی آخرت کی حسنِ رفاقت کے لیے تربیت کا اہم ذریعہ ہے۔ شادی کا معاملہ ابدی رفاقت کا معاملہ ہے۔ اس کا ایک بنیادی مقصد یہ ہے کہ جنت کی دائمی رفاقت کے لیے تربیت یافتہ مرد وعورت تیار کیے جائیں۔ گویا دنیا کی زندگی آخرت کی شادی شدہ زندگی کے لیے تربیت گاہ ہے۔ شادی شدہ زندگی کا اصل معیار یہ ہے کہ آپ ایسے انسان بن جائیں جو آخرت کے تقاضوں پر پورا اتریں۔ جو شادی آخرت کی زندگی کے لیے تربیتی حیثیت اختیار کرلے، وہی درحقیقت کامیاب شادی ہے۔ اور جس شادی میں یہ مقصد حاصل نہ ہو، وہ شادی کامیاب نہیں کہی جاسکتی ہے۔ دنیا کی شادی محض لذت یا عیش کے لیے نہیں، بلکہ وہ تربیت کے لیے ہے۔

مومن کا ہتھیار

ایک حدیث رسول ان الفاظ میں آئی ہے: أَلَا أَدُلُّكُمْ عَلَى مَا يُنْجِيكُمْ مِنْ عَدُوِّكُمْ وَيَدِرُّ لَكُمْ أَرْزَاقَكُمْ؟ تَدْعُونَ اللَّهَ فِي لَيْلِكُمْ وَنَهَارِكُمْ، فَإِنَّ الدُّعَاءَ سِلَاحُ الْمُؤْمِنِ (مسند ابی یعلی، حدیث نمبر 1812)۔ یعنی، کیا میں تمھیں وہ رہنمائی نہ کروں جو تم کو تمھارے دشمنوں سے نجات دے، اور تمھاری روزی میں اضافہ کردے۔ تم اللہ سے اپنے رات و دن میں دعا کرو، کیوں کہ دعا مومن کا ہتھیار ہے۔

ایک اور روایت میں یہ الفاظ ہیں: عَنْ عَلِيٍّ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: الدُّعَاءُ سِلَاحُ الْمُؤْمِنِ، وَعِمَادُ الدِّينِ، وَنُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ (مستدرک الحاکم، حدیث نمبر 1812)۔ علی ابن ابی طالب کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: دعا مومن کا ہتھیار ہے، دین کا ستون ہے، اور آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔

اس حدیث کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مومن جب دعا کرے تو اس کے دشمن ہلاک ہو جائیں گے۔ بلکہ یہ نفسیاتی معنی میں ہے۔ دعا ایک مومن کے لیے تسکین (solace) کا ایک عظیم ذریعہ ہے — یعنی ایک عاجزِ مطلق کا اپنے آپ کو ایک قادرِ مطلق کے سپرد کر دینا، اور اسے اپنا سہارا بنا لینا۔

غلط نشانے کا مسئلہ

کہا جاتا ہے کہ آج کی دنیا میں ہر جگہ اسلام اور مسلمانوں کے حق میں حالات سازگار نہیں ہیں، خواہ امریکا ہو یا یورپ، ایشیا ہو یا افریقہ — یہ بلاشبہ ایک غلط اندازہ ہے۔ یہ غلط اندازہ اس لیے پیدا ہوا ہے کہ امت مسلمہ کا نشانہ یہ سمجھ لیا گیا کہ ساری دنیا میں اسلام کا سیاسی غلبہ قائم کیا جائے۔ یہ غلط نشانہ ہے، اور اسی غلط نشانے کی وجہ سے مسلمان ہر ملک میں اجنبی کی طرح ہو گئے ہیں۔ اس غلط نشانے کو ایک لفظ میں سیاسی نشانہ کہہ سکتے ہیں۔

نشانے عملی طور پر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک ہے، موجود سسٹم کو بدلنا (to bring about change in the existing system)۔ اس کے مقابلے میں دوسرا نشانہ ہے، پرامن انداز میں لوگوں کو خدا کے منصوبۂ تخلیق سے باخبر کرنا۔ اگر سسٹم بدلنے کو نشانہ بنایا جائے تو اس سے ایک فریق اور دوسرا فریق ایک دوسرے کے حریف بن جاتے ہیں، اور اس کا لازمی نتیجہ ٹکراؤ کی صورت میں نکلتا ہے، یعنی کسی قابض طاقت سے ٹکرانا۔ اس قسم کا ٹکراؤ لازمی طور پر ری ایکشن پیدا کرتا ہے، اور پھر ری ایکشن، چین ری ایکشن (chain reaction) میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ اس طرح کوئی نظریہ جو سسٹم کو بدلنے یا کسی طاقت سے مزاحمت پر مبنی ہو، وہ ہمیشہ باعتبار نتیجہ ٹکراؤ کی صورت اختیار کرلے گا۔ یہی وہ ٹکراؤ ہے، جو اپنے نتیجے کے اعتبار سے شکایت، منفی سوچ اور تشدد کی صورت میں برآمد ہوتا ہے۔

اس کے برعکس، انسانوں کو خدائی پیغام سے باخبر کرنے کا عمل کامل طور پر ایک پرامن اور بے مسئلہ کام ہے۔ کیوں کہ یہ فکری تبادلہ کی نوعیت کا ایک کام ہے۔ اس عمل کے نتیجے میں جو مثبت اثرات پیدا ہوتے ہیں، وہ ہیں: رواداری، امن، باہمی خیر خواہی، پرامن ڈسکشن، اور غلط فہمی و اجنبیت کا خاتمہ۔ یہ ایک ایسا کام ہے، جو اپنے آغاز میں بھی پرامن ہے، اور اپنے انجام میں بھی پرامن۔ اس کے ذریعہ کشیدگی کا ماحول ختم ہوتا ہے، اور پرامن تعلقات کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ یہ ہر فرد کے لیے خوش گوار تجربہ ہے۔ اس کے برعکس، انسانی تاریخ کا مشاہدہ ہے کہ جب بھی سسٹم میں تبدیلی کو نشانہ بنایا گیا تو اس کے اثرات پورے معاشرے پر مرتب ہوئے، اور ہر فرد کو مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔

سچائی کی دریافت

4 جون 2019 کو میں نے ایک خواب دیکھا۔ اس خواب میں میں نے دیکھا کہ میں مولانا نظام الدین اصلاحی اعظمی سے بات کررہا ہوں۔ ان کا تعلیمی ذہن پہلے فراہی اسکول میں بنا۔ اس کے بعد وہ اسلام کی سیاسی تعبیر سے متاثر ہوئے۔ ان دو تحریکات کے درمیان ان کا فکری ڈھانچہ بنا۔ گفتگو میں ان کی بات مجھے یاد نہیں۔ مگر میں نے ان سے جو کہا وہ یہ تھا کہ پچھلے ہزاروں سال کے درمیان انسان کی کاوشوں سے افکار کا ایک جنگل تیار رہوا۔ آج جو انسان پیدا ہوتا ہے وہ افکار کے اس جنگل کے درمیان پیدا ہوتا ہے۔ سچائی اگرچہ بذات خود ایک محفوظ حقیقت ہے۔ لیکن وہ افکار کے جنگل میں اجنبی ہو چکی ہے۔ یہاں تک کہ افکار کی کثرت نے فتنۂ دُہَیماء یعنی مکمل فکری کنفیوزن (utter intellectual confusion) کی صورت اختیار کرلی ہے۔

اب سچائی کو پانے کے لیے نہ کلام عرب کی مہارت کافی ہے، اور نہ کتب خانہ میں موجود روایتی کتابوں کا مطالعہ۔ بلکہ انسان کو اپنی تلاش کا آغاز ”غارحرا“ سے کرنا ہے، دوسرے لفظوں میں یہ کہ کامل معنوں میں اپنے آپ کو حق کا طالب (truth seeker) بنانا ہے۔

موجودہ زمانہ میں سائنٹفک ٹمپر (scientific temper) یا ایز اٹ از تھنکنگ حق کے مسافر کے لیے تائیدی علم کی حیثیت رکھتا ہے۔ حدیث میں اس کو أَرِنَا الْأَشْيَاءَ كَمَا هِيَ (تفسیر الرازی، جلد 1، صفحہ 119) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی چیزوں کو ویسا ہی دیکھنا جیسا کہ فی الواقع وہ ہیں۔ آدمی جب تک افکار کے جنگل سے نکل کر ایز اٹ از تھنکنگ کی صلاحیت پیدا نہ کرے، وہ سچائی کی دریافت تک نہیں پہنچ سکتا۔ ایز اٹ از تھنکنگ (as it is thinking) نام ہے مبنی بر حقیقت سوچ کا، جو مکمل ڈی کنڈیشننگ کے بعد آدمی کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ یہ بلاشبہ ایک مشکل کام ہے۔ ڈی کنڈیشننگ ہر انسان کی ایک لازمی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر انسان کی شخصیت ایک ناقص شخصیت بنی رہے گی، وہ کبھی کامل شخصیت کا درجہ نہ پاسکے گی۔

کامیابی کا اصول

امریکا کے ڈاکٹر مائکل ہارٹ (b. 1932) نے 1978 میں ایک کتاب لکھی، جس کا نام تھا:

The 100: A Ranking of the Most Influential Persons in History

اس کتاب میں ڈاکٹر مائکل ہارٹ نے پوری انسانی تاریخ سے سو آدمیوں کا انتخاب کیا، جو ان کے نزدیک تاریخ کے سب سے بڑے انسان تھے۔ ان کی اس فہرست میں پہلا نام محمد بن عبد اللہ کا تھا، جو ان کے نزدیک پوری تاریخ انسانی کے سب سے زیادہ کامیاب انسان تھے۔ پیغمبر اسلام محمد بن عبد اللہ کے بارے میں ان کے یہ الفاظ تھے:

> He was the only man in history who was supremely successful on both the religious and secular levels.

یعنی وہ تاریخ میں واحد انسان ہیں، جو دنیوی اور مذہبی دونوں اعتبار سے بہت زیادہ کامیاب انسان تھے۔ ڈاکٹر مائکل ہارٹ نے یہ تو لکھا ہے کہ پیغمبر اسلام انسانی تاریخ کے سب سے کامیاب انسان تھے۔ مگر انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ اس عظیم کامیابی کا راز کیا تھا۔

برٹش رائٹر ای ای کلیٹ (E E Kellett) جس کی پیدائش 1864 میں ہوئی اور وفات 1950 میں ہوئی۔ اس نے پیغمبر اسلام کی عظیم کامیابی کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کا سبب یہ تھا کہ انھوں نے مصائب کا سامنا اس عزم کے ساتھ کیا کہ ناکامی سے کامیابی کو نچوڑا:

> He faced adversity with the determination to ring succes out of failure.

مگر ان الفاظ سے متعین طور پر معلوم نہیں ہوتا کہ پیغمبر اسلام کی کامیابی کا راز کیا تھا۔ راقم الحروف نے اس اعتبار سے سیرت کا مطالعہ کیا ہے۔ میری دریافت کے مطابق، اس کا راز یہ تھا کہ آپ پر ہر قسم کی مشکلات پیش آئیں۔ لیکن آپ نے کبھی ردّ عمل کا طریقہ اختیار نہیں کیا۔ آپ کا طریقہ صرف ایک تھا — ردعمل کے بجائے نتیجہ رخی پلاننگ۔

پیغمبر اسلام کو اپنی 23 سالہ پیغمبرانہ زندگی میں بار بار فریق ثانی کی طرف سے ظلم اور مخالفت کا سامنا پیش آیا۔لیکن آپ نے کبھی ردعمل (reaction) کا طریقہ اختیار نہیں کیا۔آپ نے ہر موقع پر، ظلم اور مخالفت کے باوجود، منفی ردعمل کے بجائے حکمت پر مبنی منصوبہ بندی کی۔آپ نے کبھی بھی ٹکراؤ کا راستہ اختیار نہیں کیا، بلکہ ہر حال میں مثبت انداز اپنایا۔

مثلاً قدیم مکہ کے لوگوں نے آپ کو وطن چھوڑنے پر مجبور کیا۔آپ نے اس کو ٹکراؤ کا ایشو نہیں بنایا۔ بلکہ ٹکراؤ سے ہٹ کر از سرنو اپنے عمل کی مثبت منصوبہ بندی کی۔اسی طرح فریق ثانی نے احد کی جنگ چھیڑی۔اس میں آپ کے ساتھی تقریباً ستر کی تعداد میں قتل کردیے گئے۔لیکن اس کے بعد آپ نے جوابی طور پر کوئی جنگی کارروائی نہیں کی۔ بلکہ حالات کو پرامن طور پر مینج کرتے ہوئے فریق ثانی سے حدیبیہ کے مقام پر امن کا دس سالہ معاہدہ کرلیا، وغیرہ۔یہی پالیسی آپ کی پوری زندگی جاری رہی۔

پیغمبر اسلام کا مشن ایک پرامن مشن تھا۔وہ انسان کی خیر خواہی پر مبنی تھا۔یعنی لوگوں کو اللہ کی رحمت اور جنت کے راستہ سے باخبر کرنا۔اس پرامن مشن میں لوگوں سے نفرت اور تشدد کرنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ چنانچہ آپ نے ایک بااصول انسان کی حیثیت سے یہ کیا کہ ہر صورت حال کا مثبت جواب (positive response) دیا۔آپ کا طریقہ یہ تھا — ظلم کے بدلے میں معافی، تشدد کے جواب میں امن، دشمنی کے جواب میں معتدل تعلقات۔یہی طریقہ آپ کے مشن کے شایان شان تھا، اور اسی طریقے نے آپ کو تاریخ کی عظیم کامیابی عطا کی۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ امت مسلمہ کے لیے نمونہ ہیں (33:21)۔اس کا مطلب یہ ہے کہ امت مسلمہ کو بھی اپنے معاملے میں اسی نمونے کو اختیار کرنا چاہیے۔یہی کامیابی کا طریقہ ہے۔کوئی اور طریقہ کامیابی کا طریقہ نہیں۔اس طریقے میں کامیابی کا راز اس لیے ہے کہ یہی طریقہ فطرت کے مطابق ہے، اور جو طریقہ فطرت کے مطابق ہو، اس دنیا میں کامیابی اسی طریقے کی پیروی سے حاصل ہوتی ہے۔اس دنیا میں کوئی دوسرا طریقہ کامیابی کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔

خیر کا راستہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: لَا يُؤْمِنُ الْعَبْدُ الْإِيمَانَ كُلَّهُ، حَتَّى يَتْرُكَ ... الْمِرَاءَ وَإِنْ كَانَ صَادِقًا (مسند احمد، حدیث نمبر 8766)۔ یعنی، ایک انسان مکمل ایمان کے درجہ کو نہیں پہنچ سکتا، یہاں تک کہ وہ بیجا تکرار کو ترک کردے اگرچہ وہ سچائی پر ہو۔

حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے ایک اور روایت ان الفاظ میں آئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: أَنَا زَعِيمٌ بِبَيْتٍ فِي رَبَضِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ وَإِنْ كَانَ مُحِقًّا (سنن ابو داؤد، حدیث نمبر 4800)۔ یعنی، میں اس آدمی کے لیے جنت کے اطراف میں ایک گھر کی ضمانت لیتا ہوں جو بیجا بحث کو ترک کردے اگرچہ وہ حق پر ہو۔

غور سے دیکھا جائے تو یہی وہ طرزِ عمل ہے جو انسانی سماج کو ایک پُرامن سماج بناتا ہے۔ ”جنت کے اطراف میں ایک گھر“ سے مراد ممکنہ طور پر اسی قسم کا گھر ہو سکتا ہے، جس کا تصور آج کے دور میں فارم ہاؤس وغیرہ کی شکل میں کیا جاتا ہے۔

A farmhouse is typically a property situated in an agricultural setting, surrounded by greenery, and used for residential purposes. These charming abodes are often nestled amid farmland or landscaped gardens in rural areas, providing a serene and picturesque environment. Imagine waking up to the sound of birds chirping and enjoying fresh air away from the hustle and bustle of city life. In India, farmhouses have gained popularity as weekend getaways or second homes. They offer a peaceful retreat where families and friends can relax, unwind, and connect with nature.

یعنی ایک انسان اگر حق پر رہتے ہوئے بھی اپنے ایگو (ego) کو کنٹرول کرکے جھگڑے کے موقع پر خاموشی کا طریقہ اختیار کرلے تو اس کو جنتی گھر ملنے کے علاوہ ایک اور گھر بھی ملے گا، یہ گھر صرف اس جنتی کے اعزاز و اکرام میں اضافہ کے لیے ہوگا، نہ کہ دنیا کی مانند ریگولر گھر میں بورڈم (boredom) کا شکار ہونے کے بعد ریلکس (relax) ہونے کے لیے۔

ان دونوں حدیثوں میں بحث وتکرار کو ڈسکرج (discourage) کرنے سے مراد وہ بحث اور تکرار ہے جو منفی یا بے نتیجہ بحث ہو۔ موجودہ دور میں ایسے علما اور مقررین کی کثرت ہوگئی ہے جو اپنی تحریر اور تقریر سے سماج میں نفرت پیدا کرتے ہیں۔ ان کی باتوں سے عام لوگ اسلام کے بارے میں کنفیوزن میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ آپس میں نفرت پیدا ہوجاتی ہے مثلاً مناظرہ بازی، یا کفر وضلالت کا حکم لگانا، یا حق کے نام پر دو یا زیادہ عالموں کا بذریعہ دلائل ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش کرنا، وغیرہ۔ سوشل میڈیا سے پہلے اس کا نمونہ عام طور پر مناظرہ کے اسٹیجوں پر دیکھنے کو ملتا تھا، یا فتووں میں۔ آج کل اس کا نمونہ عام طور پر جلسوں میں دیکھنے کو ملتا ہے یا سوشل میڈیا پلیٹ فارم پر۔

یہ تمام کام بظاہر دین کے نام پر کیے جاتے ہیں، مگر وہ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے عام لوگوں کے لیے دین سے دوری کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی بھی رسول کو اس لیے نہیں بھیجا کہ وہ انسانوں کو خدا کے دین کے تعلق سے کنفیوزن میں مبتلا کرے، یا ان کا کوئی عمل خدا کے دین کی بدنامی کا ذریعہ بن جائے۔ اس لیے موجودہ دور میں جاری اِس قسم کی کج بحثیاں ابلیس کو خوش کرنے کا ذریعہ تو بن سکتی ہیں، مگر وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ عمل نہیں ہوسکتیں۔

انبیا کا وارث ہونے کی حیثیت سے ایک عالم دین کو کیسا ہونا چاہیے، وہ قرآن کی ایک آیت اور اس کی تفسیر سے سمجھا جاسکتا ہے۔ قرآن میں ہے: وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيْنَمَا كُنتُ (19:31)۔ یعنی، حضرت عیسیٰ نے کہا کہ میں جہاں کہیں بھی رہوں اللہ تعالیٰ نے مجھ کو برکت والا بنایا ہے۔ مجاہد تابعی نے بابرکت کی تشریح خیر کا معلم (مُعَلِّمًا لِلْخَيْرِ) سے کی ہے (العلم لابی خیثمہ زُہیر بن حرب 30)۔ انطباقی معنی (applied meaning) کے اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے کہ حقیقی عالمِ دین وہ ہے جو سماج میں خیر اور بھائی چارہ اور امید اور یقین کا داعی بن کر رہے، نہ کہ شر اور نفرت اور شک اور کنفیوزن کا تاجر بن کر۔ (مولانا فرہاد احمد)

سائنس کا رجحان

اللہ نے سائنس کو خدا کی معرفت کے لیے بطور تائید پیدا کیا ہے۔ لیکن سائنس کی تاریخ بتاتی ہے کہ ایسا نہیں ہوسکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بعد میں سائنس کے دو پہلو ہو گئے تھے۔ ایک، نظری سائنس (basic science)، جس سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرا ہے اپلائڈ سائنس۔

یہ ایک معلوم بات ہے کہ ہر اصول کا ایک عملی انطباق ہوتا ہے۔ مثلاً اسپریچولیٹی کے عملی انطباق کو اپلائڈ اسپریچولیٹی (applied spirituality) کہا جاتا ہے۔ اِسی طرح سائنس کے عملی انطباق کو اپلائڈ سائنس (applied science) کہا جاتا ہے۔ یعنی بنیادی طور پر سائنس کے دو شعبے ہیں — بیسک سائنس، اپلائڈ سائنس۔ بیسک سائنس سے مراد نظریاتی سائنس ہے، اس کو پیور سائنس (pure science) بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اپلائڈ سائنس سے مراد سائنس کے وہ پریکٹکل شعبے ہیں، جو کمپیوٹر اور میڈیکل اور انجینئرنگ، وغیرہ کہے جاتے ہیں۔ چار سو سال پہلے جب سائنس شروع ہوئی تو اس وقت سائنس صرف سائنس کے بیسک شعبوں کا نام ہوتا تھا۔

ابتدائی زمانے میں بیسک سائنس کا زیادہ رواج تھا۔ لیکن تمام مادی فائدے اپلائڈ سائنس سے حاصل ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے سارے لوگ اپلائڈ سائنس کی طرف جارہے ہیں، اب بہت کم لوگ نظری سائنس کی طرف جاتے ہیں۔ کیوں کہ اس میں مادی فائدہ بہت کم ہے۔

بیسویں صدی میں بیسک سائنس کا شعبہ زیادہ نمایاں تھا۔ اس زمانے میں حقائق سائنس سے زیادہ بحث ہوا کرتی تھی۔ چنانچہ اکثر بڑے سائنٹسٹ اسی نظریاتی دور میں پیدا ہوئے۔ بیسک سائنس میں جو مشہور ہوئے، ان میں سے چند یہ ہیں: سر جیمس جینز، سر آرتھر ایڈنگٹن، الفریڈ نارتھ وائٹ ہڈ (Alfred North Whitehead)، فرڈ ہائل (Fred Hoyel)، وغیرہ۔ موجودہ زمانے میں اپلائڈ سائنس کا غلبہ ہو گیا ہے۔ یہ لوگوں کے اندر مٹیریلزم کے پھیلاؤ کی بنا پر ہے، نہ کہ خود سائنس کے تقاضے کی بنا پر۔

خالق کا وجود

رینے ڈیکارٹ (Rene Descartes, 1596-1650) فرانس کا مشہور فلسفی ہے۔ اس کے سامنے یہ فلسفیانہ سوال تھا کہ انسان کے وجود کا ثبوت کیا ہے۔ اس نے کہا کہ: میں سوچتا ہوں، اس لیے میں ہوں:

> I think, therefore, I am. (*The Principles of Philosophy* by Descartes, part 1)

یہ فارمولا بالکل درست ہے۔ اس فارمولے کی توسیع کرتے ہوئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ جہاں انجینئرنگ ہے، وہاں انجینئر ہے۔ جہاں بلڈنگ ہے، وہاں بلڈر ہے۔ اسی طرح جہاں تخلیق ہے، وہاں خالق ہے:

> Where there is creations, there is creator.
> Where there is engineering, there is an engineer.
> Where there is a design, there is a designer.

یہ بالکل ایک سادہ منطق (simple logic) ہے۔ انسان کی فطرت اس منطق کو تسلیم کرتی ہے۔ لیکن بعض لوگ ذہنی تشکیک کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ اگر خدا نے کائنات کو بنایا تو خود خدا کو کس نے بنایا، مگر یہ سوال ایک غیر منطقی سوال ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہمارے سامنے ایک حقیقی دنیا موجود ہے۔ ہم مجبور ہیں کہ اس دنیا کو مانیں۔ اس لیے اس دنیا میں ہمارے لیے جو آپشن ہے، وہ بے خدا کائنات اور باخدا کائنات کے درمیان نہیں ہے، بلکہ وہ باخدا کائنات اور غیر موجود کائنات کے درمیان ہے۔ چوں کہ ہم کائنات کی موجودگی کا انکار نہیں کر سکتے، اس لیے ہم خدا کی موجودگی کا بھی انکار نہیں کر سکتے:

> The choice is not between a universe with God and a universe without God. The real choice is between a universe with God — or no universe at all.

سیاسی اقتدار

فطرت کا ایک قانون قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (3:26)۔ تم کہو، اے اللہ، سلطنت کے مالک تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے، اور تو جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے۔ تیرے ہاتھ میں ہے سب خوبی۔ بیشک تو ہر چیز پر قادر ہے۔

سیاسی اقتدار اجتماعی نظم (administration) کا ایک حصہ ہے۔ وہ عمومی مصلحت کے تحت کبھی ایک گروہ کو ملتا ہے، اور کبھی دوسرے گروہ کو۔ اقتدار خواہ کسی گروہ کو دیا جائے، یا اس سے واپس لے لیا جائے، دونوں عارضی ذمے داری کے معاملات ہیں۔ دونوں فریقوں کو چاہیے کہ وہ اس معاملے کو مثبت سوچ کے تحت قبول کریں، جس کو دیا جائے، وہ بھی، اور جس سے واپس لیا جائے، وہ بھی۔

اس اصول کی روشنی میں مسلم تاریخ کا مطالعہ کیجیے۔ مسلم تاریخ کا آغاز ساتویں صدی عیسوی کے ربعِ اول میں ہوا۔ تقریباً ایک ہزار سال تک قدیم آباد دنیا کا ایک متعین رقبہ مسلم قوموں کے زیر انتظام رہا۔ تقریباً ایک ہزار سال کے بعد یہ اقتدار ان سے لے کر دوسری قوموں کی طرف منتقل کر دیا گیا۔ بالفاظ دیگر مسلمانوں کا اقتدار دنیا پر قبل از سائنسی تہذیب دور (pre-scientific age) میں رہا، اور ان سے اقتدار لے لیا گیا جب کہ سائنسی تہذیب کا دور (post-scientific age) آ گیا۔ سائنسی تہذیب کو وجود میں لانے والے وہ لوگ تھے، جن کو مغربی اقوام کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن وسنت میں جو حوالے ملتے ہیں، ان کا مطالعہ تطبیقی انداز (applied way) میں کیا جائے تو اس معاملے کی حکمت واضح طور پر معلوم ہوتی ہے۔

جب قرآن اترا اور امت محمدی کو اس کی ذمے داری سونپی گئی تو اس ذمے داری کے دو بڑے حصے تھے۔ ایک، حفاظت حق (الحجر، 15:9) اور دوسرا، تبیین حق (فصلت، 41:53)۔ تاریخ بتاتی ہے کہ امت مسلمہ کو جو اقتدار دیا گیا، اس کو انھوں نے حفاظتِ دین کے معاملے میں بحسن وخوبی

انجام دیا، لیکن فطرت کے قانون (الحدید، 57:16) کے مطابق، امت مسلمہ پر زوال کا دور آیا۔ اب ان کا حال وہ ہو گیا جو قرآن میں قوم یہود کے حوالے سے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا (62:5)۔ یعنی، ان لوگوں کو توراۃ کا حامل بنایا گیا پھر انھوں نے اس کو نہ اٹھایا۔

موجودہ دور میں امت مسلمہ اپنی مسجدوں، اپنے مدرسوں، اور اپنے اداروں کی شکل میں دین کے محافظ تو بن گئے، لیکن زمانے کے اعتبار سے دین کی تبیین مزید کے لیے وہ نااہل ہو گئے۔ اس کی ایک ظاہری وجہ یہ ہے کہ اجتہاد کے فقدان کی بنا پر وہ بصیرت زمانہ سے محروم ہو گئے اور عصری تقاضے کے مطابق دین کی تطبیق سے قاصر رہے۔

اب اللہ تعالیٰ کے قانون استبدال (محمد، 47:38) کے مطابق، حالات میں تبدیلی آئی۔ ملت مسلمہ کے لوگ فارم کی سطح پر دین کا حفاظتی ڈھانچہ بدستور برقرار رکھے ہوئے تھے۔ لیکن زمانے کے تقاضے کے مطابق دین کی تبیینِ مزید (فصلت، 41:53) میں وہ مکمل طور پر ناکام ہو گئے تھے۔ یعنی، قرآن کے الفاظ میں آیات وانفس کی دریافت کے ذریعے حق کی تبیینِ مزید کرنا۔

تاریخ کا یہ مرحلہ (juncture) انیسویں صدی کے خاتمہ اور بیسویں صدی کے آغاز کے وقت پیش آیا۔ اب اللہ تعالیٰ نے تقسیم کار کے اصول کو استعمال کیا، یعنی مغربی قوموں کو تائید کا رول (supporting role) اور امت مسلمہ کے واسطے دین کے لیے پیدا شدہ مواقع کو ممکنہ طور پر اویل (avail) کرنے کا رول۔ اس تائیدی رول کا ذکر حدیث کی کتابوں میں واضح طور پر موجود ہے۔

اس معاملے میں صحیح البخاری (حدیث نمبر 3062) کی روایت سے ایک اہم بات معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ بالفرض یہ مؤیدین امت مسلمہ کو فاجر دکھائی دیں، تب بھی دین کے معاملے میں اپنے مؤید کی حیثیت سے ان کو قبول کرنا چاہیے۔ اگر مسلمان اس قبولیت میں ناکام رہیں تو وہ خود اپنی ذمے داری کو پورا کرنے میں ناکام ہوجائیں گے۔ مشاہدہ بتاتا ہے کہ یہی وہ مقام ہے، جہاں مسلمان اپنی ذمے داری کو ادا کرنے میں مکمل طور پر ناکام ہو گئے۔

مین میڈ، گاڈ میڈ

بی بی سی اردو کی ویب سائٹ پر 28 جولائی 2017 کو ایک رپورٹ اس عنوان سے چھپی تھی:

"کیا مشینیں انسانوں کی جگہ لے لیں گی؟"

آکسفورڈ یونیورسٹی کے فیوچر آف ہیومینٹی انسٹی ٹیوٹ کی کٹجا گریسی (Katja Grace) اور ان کے ساتھیوں نے اس موضوع پر کافی کام کیا ہے۔ انھوں نے دنیا بھر کے 352 سائنس دانوں سے بات کر کے اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس ریسرچ کے مطابق اس بات کی پچاس فیصد امید ہے کہ اگلے سوا سو سال میں انسان کا ہر کام مشینیں کریں گی — روبوٹ کے تعلق سے برابر خبریں آتی رہتی ہیں۔ مگر کیا ایسا ہوسکتا ہے۔ مذکورہ ریسرچ میں سب سے حیرت انگیز بات یہ سامنے آئی کہ مشینیں اتنی تیزی سے بہتر نہیں ہو رہی ہیں جتنا کہ سائنسدان دعوی کر رہے تھے۔ مشینوں کا دور آنے میں ابھی کافی وقت لگے گا۔ اس ریسرچ میں آٹومیٹڈ انسائٹس (Automated Insights) کے چیف آپریٹنگ آفیسر ایڈم سمتھ کے حوالے سے یہ کہا گیا ہے کہ ٹیکنالوجی کا مقصد انسانوں کی مدد کرنا ہے۔ وہ انسانوں کی جگہ مکمل طور پر نہیں لے سکتی۔ مشینوں کے ذریعے صحافت پہلے نہیں تھی لیکن اب بھی جو مضامین اے آئی (AI) تیار کرتے ہیں، ان میں انسانی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ روبوٹ ایک انسان میڈ پروڈکٹ ہے، وہ اس ذہانت اور صلاحیت کو ہرگز نہیں پاسکتا، جو خود انسان کے اندر موجود ہے۔ اس حقیقت کو ذیل کے واقعہ سے سمجھا جاسکتا ہے:

9 جنوری 2022 کو بزنس انسائڈر (انڈیا) کی ویب سائٹ پر چھپی ایک دل چسپ رپورٹ کے مطابق، یونائٹیڈ کنگڈم کے ایک قصبہ ملٹن کینز (Milton Keynes) میں ایک ریسٹوراں نے چار روبوٹ کسٹمرز کو کھانا سرو (serve) کرنے کے لیے جاپان سے خریدا تھا۔ مگر بعد میں ریسٹوراں کے مالک کی یہ رائے بنی کہ مشین انسان کی جگہ نہیں لے سکتی۔ اس کا کہنا ہے کہ روبوٹ

میں کچھ بنیادی خامیاں پائی جاتی ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہوٹل انڈسٹری میں انسان ایک نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ مثلاً روبوٹ زیادہ زیورات والے کسٹمر کو دیکھ کر کام نہیں کر سکتے ہیں، وہ غیر ضروری سوالات کرتے ہیں، بیٹری ختم ہونے پر کام ادھورا چھوڑ کر چارج ہونے کے لیے فوراً رک جاتے ہیں، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ انسان نہیں ہیں، جو آگے بڑھ کر گاہکوں کا گرمجوشی سے خیر مقدم کر سکیں اور ان کو اپنائیت کا احساس دلا سکیں۔

The owners of a restaurant employing 4 robot servers reveal the drawbacks - and explain why humans are crucial

Restaurant owners employing four robot servers say machines won't replace all their human servers. They said their robots had drawbacks, such as running away from customers wearing lots of jewelry. Amy, Ella, Will, and Josh work in a restaurant as servers. They bring food to tables, interact with guests, and from time to time, they roll away to recharge their batteries. All four of them are robots, and they're the main attraction at Robotazia, a restaurant in Milton Keynes, UK. Even so, Robotazia's owners, Joy Gittens and Mark Swannell, told Insider they'd never replace all their human servers with machines, because the robots have a few notable drawbacks.

They run away from guests wearing lots of jewelry: The robots turn around and roll away from guests wearing lots of metal jewelry, which has something to do with signals being reflected off the metal. "They'll go over to the table for delivery but not let people take their food off the tray, and then turn away," Gittens said. Gittens and Swannell said they have to first check if customers are wearing lots of jewelry in order for them to "get the best experience."

They chat too much: Amy has an interactive function that allows her to respond to customers' questions."We turned that off because you would never get a delivery done as she would stay there having conversations," Gittens said. The robots, which were manufactured in Japan, also spoke in "an odd sort of English which didn't quite make sense," Swannell said. Amy, who served my meal, spoke with a robotic American accent, but she didn't ask any questions or respond to mine. Instead, she said "bon appetit" before heading back to her base.

They give up work when they're hungry: When the robots need to recharge, they make a quick exit. "If they have had enough and they feel that their charge is going low, they tell you they need to recharge,"Gittens said. "No matter what they're doing, they go off and put themselves at their set points," she said, referring to their charging stations. Amy did this during one of the restaurant's busiest Saturdays, Gittens said. Gittens said she made light of the situation by telling guests that "at least she knows when she needs a recharge." The robots are also capable of displaying certain emotions. For example, if a customer gets too close, a tear appears on the robot's face.

They can't perform some basic tasks: The robots can deliver food on trays but they can't clear tables. They also can't check if a person is old enough to buy alcohol. Further, they can't clean themselves or change their batteries. Gittens and Swannell employ four humans, one for each robot, to keep them in working order. The robots are more expensive to employ than human servers, Swannell said. This is partly down to maintenance. Swannell said he fixes or tweaks parts on the robots every Tuesday.

They're not human: Swannell and Gittens say they value their human servers. Robotazia's website says "people are at the core of our business and the hospitality industry." Gittens said: "Human engagement is still a wonderful thing to have. It's the warmth of that person saying, 'How are you? Thank you for coming to Robotazia.'"

ایسی خبریں آتی رہتی ہیں۔ یہ واقعات اس حقیقت کو واضح کرتے ہیں کہ اگرچہ انسان ایک محدود اور عاجز مخلوق ہے، لیکن اسے ایک نہایت ذہین اور قادرِ مطلق ہستی نے پیدا کیا ہے۔ اس ہستی نے انسان کو اپنی طرف سے اتنی ذہانت عطا کی ہے کہ وہ روبوٹ جیسے حیرت انگیز آلات تو بنا سکتا ہے، مگر ان میں وہ خوبی ہرگز نہیں ڈال سکتا جو خود انسان کے اندر موجود ہے۔

اسپین کا سبق

میں نے دوبارا اسپین کا سفر کیا ہے، اور اسپین کے حالات کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے۔ اسپین میں پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے ایک قیمتی مثال ہے۔ اسپین میں عبد الرحمن الداخل کی قائم کردہ حکومت ایک لمبی مدت قائم رہی۔ اس کے بعد مقامی لوگوں نے عربوں کو حملہ آور کے خانے میں ڈال دیا۔ ایک مدت تک یہ چلا کہ عربوں کو مارو، اور باہر نکالو۔ لیکن کچھ عرصہ بعد اسپینیوں کو محسوس ہوا کہ یہ ہم خود اپنے اثاثے سے اپنے آپ کو محروم کررہے ہیں۔ اس مدت میں اسپین کی اکانومی کی ترقی رک گئی۔ وہ منفی سرگرمیوں میں مشغول ہوگئے۔ لیکن پھر انھوں نے یہ دیکھا کہ اسپین میں عربوں کے دور کے بہت سے تاریخی آثار ہیں، جو سیاحوں کو اٹریکٹ (attract) کرتے ہیں۔

چنانچہ انھوں نے ان تاریخی آثار کو دوبارہ ڈیولپ کیا۔ اس کے نتیجے میں یہ اسپین دوبارہ سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز بن گیا۔ اسپین میں سیاحوں کی آمد اتنی بڑھی کہ اسپین جو پہلے غیر ترقی یافتہ ملک بن گیا تھا، وہ دوبارہ مزید اضافے کے ساتھ ایک ترقی یافتہ ملک بن گیا۔ سیاحت نے موجودہ اسپین کی ترقی میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔

قدیم اسپین جو اہل اسپین کے لیے اس سے پہلے ان کی منفی سوچ کی بنا پر ایک بوجھ (liability) بن گیا تھا، وہ دوبارہ اہل اسپین کی مثبت سوچ کی بنا پر ان کے لیے سرمایہ (asset) بن گیا۔ پہلے جو چیز اسپین کی تاریخ کا معمولی حصہ بنی ہوئی تھی، اب وہ اس کی تاریخ کا غیر معمولی حصہ بن گئی۔

اسپین کے واقعے میں انسان کے لیے یہ سبق ہے کہ وہ اپنے سماج کا سرمایہ (asset) بن کر زندگی گزارے تو کسی کو اس سے شکایت نہ ہوگی۔ ہر عورت اور مرد کو چاہیے کہ وہ دیکھے کہ صبح وشام لوگوں کے درمیان وہ جس سلوک کا مظاہرہ کرتا ہے، وہ کیسا ہے۔ وہ تعمیری ہے یا تخریبی، وہ مثبت ہے یا منفی۔ اس کے اندر جو شخصیت بن رہی ہے، وہ خیر خواہی پر مبنی پرسنالٹی ہے، یا استحصال (exploitation) پر مبنی پرسنالٹی۔ وہ سماج کا ایک دینے والا ممبر (giver member) ہے یا لینے والا ممبر، اس کی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچ رہا ہے یا نقصان، وغیرہ۔ کامیاب انسان وہ ہے، جو زندگی کی اس نوعیت کو سمجھے، اور اس کے مطابق زندگی گزارے۔

ڈائری 1986

6 جولائی 1986

جناب سکندر بخت صاحب (پیدائش 1918ء) تشریف لائے۔ مسلمانوں میں وہ عام طور پر بدنام ہیں۔ مگر گفتگو سے اندازہ ہوا کہ ان کے اندر مسلم ملت کا درد ہے اور وہ مسلمانوں کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ (2004 میں ان کا انتقال ہو گیا)

سکندر بخت صاحب نوجوانی کی عمر سے سیاست میں رہے ہیں۔ انہوں نے مسٹر محمد علی جناح (1876-1948) کا ایک واقعہ بتایا جن کو مسلمانوں نے قائداعظم بنایا تھا۔ کسی مقام پر مسلم لیگ کا اجلاس تھا۔ مسٹر جناح وہاں تقریر کرنے کے لیے گئے۔ انہوں نے دیکھا کہ مسلم عوام کافی تعداد میں جمع ہیں، مگر اخبار کے نمائندے نظر نہیں آئے۔ مسٹر جناح نے اجتماع کے منتظمین سے کہا:

> Where are the pressmen? Do you think I came here to address these fools.

اخباری نمائندے کہاں ہیں؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں ان بے وقوفوں کو خطاب کرنے کے لیے یہاں آیا ہوں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسٹر جناح مسلمانوں کو حقیر سمجھتے تھے۔ اس کے باوجود مسٹر جناح کو مسلمانوں میں زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کی وجہ صرف ایک تھی۔ اور وہ یہ کہ انہوں نے مسلمانوں کو وہ سیاسی خوراک دی جو اس ملک کے مسلمانوں کو سب سے زیادہ مرغوب ہے، یعنی قومی فخر اور اینٹی نان مسلم جذبات کو فیڈ کرنا۔

7 جولائی 1986

فقہ کی مشہور کتاب ہے جس کا نام شامی (یا فتاویٰ شامیہ) ہے۔ یہ علامہ ابن عابدین شامی کی طرف منسوب ہے۔ شامی کا اصل نام "رد المحتار علی الدر المختار" ہے۔ رد المحتار حاشیہ ہے درمختار کا اور درمختار شرح ہے تنویر الابصار کی۔

یعنی تنویر الابصار متن، درمختار شرح اور رد المحتار حاشیہ درمختار کا۔

تنویر الابصار کے مصنف کا نام محمد بن عبداللہ تمرتاشی (939-1004ھ) ہے۔ درمختار کے مصنف کا نام محمد بن علی حصکفی (1025-1088ھ) ہے اور ردالمختار کے مصنف محمد امین بن سید شریف عمر (علامہ ابن عابدین شامی، 1198-1252ھ) ہیں۔

بعد کے زمانے میں مسلمانوں میں ایک عجیب علمی رواج پیدا ہوا، جس کو شرح کہا جاتا ہے۔ یعنی کسی کتاب کی شرح اور پھر اس شرح کی شرح۔ اس طریق تصنیف کا دو واضح نقصان ہے۔

ایک یہ کہ بعض کتابوں کا متن، اگر عقیدۃً نہیں تو عملاً مقدس قرار دیا گیا۔ ان متون کے متعلق شعوری یا غیر شعوری طور پر یہ سمجھ لیا گیا کہ ان میں جو کچھ درج ہے، وہ بہر حال مستند ہے۔ اب ہمیں جو کچھ کرنا ہے وہ صرف یہ کہ اس کو پڑھ کر اس کی شرح کریں۔

اس کا دوسرا نقصان ذہنی جمود کی شکل میں امت کو ملا۔ تخلیقی فکر (original thinking) ختم ہوگئی۔ صرف تقلیدی فکر علمی دنیا میں باقی رہ گئی۔

عین اس زمانہ میں جب کہ مغربی دنیا اپنی تحقیقی فکر کے ذریعہ سے عالمی سیادت حاصل کر رہی تھی، مسلمان اپنی تقلیدی فکر کے نتیجہ میں پستی میں پڑے رہے۔ اور صدیوں کے لیے انسانی قافلہ سے پیچھے ہوگئے۔

8 جولائی 1986

ایک مسلمان صنعت کار ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ میں ان کو پچھلے چالیس سال سے جانتا ہوں۔ انھوں نے 1945 میں اتر پردیش میں ایک معمولی کام سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔ ایک دستکاری کا کام تھا، جس کے تنہا مزدور وہ خود تھے۔ ان کی اس دستکاری کے 99 فیصد خریدار ہندو تھے۔

اس دوران ان کی ترقی ہوتی رہی۔ وہ پہلے پیدل چلتے تھے۔ اس کے بعد انھوں نے ایک سائیکل خریدی۔ اس کے بعد انھوں نے شہر میں ایک ذاتی مکان بنایا، جس کے سامنے ایک جیپ کھڑی ہوئی نظر آنے لگی۔ اس کے بعد وہ وقت آیا جب کہ وہ کاروں کے ایک دستہ کے مالک ہو گئے۔ اب وہ ایک لمیٹڈ کمپنی کے چیئرمین ہیں۔ وہ ہوائی جہازوں پر سفر کرتے ہیں۔ مجھ سے ملنے کے لیے وہ نئی مرسڈیز کار میں تشریف لائے تھے۔

ان کی یہ ترقیاں بلاشبہ میرے لیے خوشی کا باعث ہیں۔ مگر میں یہاں ان کے ایک تضاد کا ذکر کرنا

چاہتا ہوں۔ ان کا کاروبار زیادہ تر حکومت کے محکموں سے ہے۔ ہندوستان کی کئی ریاستوں میں ان کے سرکاری ٹھیکے چل رہے ہیں۔ اس طرح ان کا کاروباری تعلق جن لوگوں سے ہے ان میں 99 فیصد ہندو ہوتے ہیں۔ ان ہندوؤں سے وہ بہترین تعلقات بنائے ہوئے ہیں۔ ان سے میٹھی گفتگو کرنا، ان کو تحفے دینا، ان کی ضرورتوں میں کام آنا، ان کو خوش کرنے کا ہر طرح سے جتن کرنا، وغیرہ۔ مگر دوسری طرف ان کا یہ حال ہے کہ جب بھی مجھ سے ملتے ہیں تو کسی نہ کسی بہانے ہندو قوم اور ہندو حکومت کی برائی کرتے ہیں۔ اپنے معاملہ دار ہندوؤں کے لیے وہ تالیف قلب کے اصول پر عامل ہیں۔ مگر دوسرے ہندوؤں کے لیے وہ پوری طرح مسلم قوم پرست بنے ہوئے ہیں۔

یہی ہندوستان کے تقریباً تمام مسلمانوں کا طریقہ ہے۔ اس ملک کا ہر مسلمان، خواہ وہ اصاغر میں سے ہو یا اکابر میں سے، ڈبل اسٹینڈرڈ کا کیس بنا ہوا ہے۔ وہ اپنے صاحب معاملہ ہندو کے لیے کچھ اور ہے اور دوسرے ہندوؤں کے لیے کچھ اور۔

کیسے عجیب ہیں وہ مسلمان جن کو خود اپنی ہی زندگی کے تجربے سے سبق نہیں ملتا۔

9 جولائی 1986

7 جولائی 1986 کے تمام اخبارات کی شاہ سرخی صرف ایک تھی:

”جگ جیون رام کا انتقال ہو گیا“

جگ جیون رام (1986-1908) ڈاکٹر امبیڈکر کے بعد دوسرے سب سے بڑے ہریجن لیڈر تھے۔ ان کو جدید ہندوستان میں عظیم ترین سیاست دانوں کی فہرست میں جگہ ملی۔ مگر جنتا حکومت کے بعد جب ان کا زوال ہوا تو پھر وہ دوبارہ اٹھ نہ سکے۔ دہلی کے ایک انگریزی اخبار نے ان کی موت پر اپنے اداریہ میں لکھا:

> In the death of Jagjiwan Ram the country lost one of the last leading representatives of the pre-independndce era. Babuji had a messianic sense of mission wich he shared with our greats like Nehru and Mrs. Gandhi. But the great reaper precluded his return to glory. (*The Hindustan Times*, July 8, 1986)

جگ جیون رام کی موت نے ملک کو قبل از آزادی دور کے بڑے نمائندوں میں سے ایک سے محروم کردیا۔ بابو جی (جگ جیون رام) مقصد کا ایک مسیحائی شعور رکھتے تھے۔ وہ نہرو اور مسز گاندھی جیسی بڑی شخصیتوں کے رفیق رہے۔ مگر موت ان کے لیے مانع بن گئی کہ وہ دوبارہ اپنی عظمت کی طرف واپس ہوسکیں۔

اخبار کے ایڈیٹر کی نظر میں بظاہر صرف ''جگ جیون رام'' جیسے لوگ ہیں، جن کے لیے موت ان کی آخری عظمت تک پہنچنے میں رکاوٹ بن گئی۔ لیکن ایڈیٹر اگر موت کے اس پار تک دیکھ سکتا تو اس کو نظر آتا کہ بہت سے وہ دوسرے لوگ بھی اپنی آخری عظمت سے یکسر محروم ہیں، جن کا نام اخبار کے ایڈیٹر نے عظمت کی چوٹی تک پہنچنے والے انسانوں کی فہرست میں نمایاں طور پر لکھ رکھا ہے۔

10 جولائی 1986

ایک عرب ڈپلومیٹ ہندوستان سے واپس جانے لگے تو روانگی سے ایک دن پہلے وہ ہمارے دفتر میں آئے۔ ان کے ساتھ ان کی بڑی گاڑی میں بہت سی کتابیں بھی لدی ہوئی تھیں۔ انھوں نے کہا کہ یہ میری ذاتی لائبریری کی کتابیں ہیں۔ دہلی کے زمانۂ قیام میں، میں نے ان کو اپنی رہائش گاہ پر جمع کیا تھا۔ اب ہندوستان چھوڑتے ہوئے میں ان کتابوں کو اسلامی مرکز کے کتب خانے کے حوالے کر رہا ہوں۔

یہ کتابیں سب کی سب دو زبانوں میں تھیں، عربی اور انگریزی۔ ایک کتاب گاندھی جی کی مشہور سوانح عمری تھی:

The Life of Mahatma Gandhi by Louis Fischer

میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کی کتابوں کے ذخیرے میں مہاتما گاندھی کی لائف بھی ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ مہاتما گاندھی کے عقیدت مندوں میں سے ہیں؟۔ وہ یہ سوال سن کر مسکرائے۔ انھوں نے کہا کہ اس کا یہ مطلب نہیں۔ یہ کتابیں میرے شخصی ذوق سے زیادہ میرے ڈپلومیٹ ہونے کی حیثیت سے تعلق رکھتی ہیں۔ کسی ملک کا ڈپلومیٹ جب دوسرے ملک میں جاتا

ہے تو اس سے یہ امید کی جاتی ہے کہ وہ اس ملک کے حالات کو جانے گا اور وہاں کی ممتاز شخصیتوں سے باخبر ہوگا۔ یہی وہ چیز ہے، جس کی بنا پر ہیں نے ہندوستان میں آنے کے بعد مہاتما گاندھی کو پڑھا، جن کو Father of the Nation کہا جاتا ہے۔

اکثر غلط فہمیاں اس لیے پیدا ہوتی ہیں کہ آدمی پوری بات جانے بغیر رائے قائم کر لیتا ہے۔ مذکورہ واقعہ کو اگر ایک شخص بلاتحقیق دیکھے تو وہ یہ رائے قائم کر لے گا کہ عرب ڈپلومیٹ مہاتما گاندھی سے متاثر تھا۔ مگر تحقیق نے بتایا کہ اس کا تعلق ڈپلومیٹ کی سرکاری ڈیوٹی سے تھا، نہ کہ اس کے ذاتی ذوق سے۔

11 جولائی 1986

مہاتما گاندھی ہندوستان کے عوام کو انگریز کے خلاف اٹھانا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہیں بہت سی روایات توڑ دینی پڑیں۔ طالب علموں کو انہوں نے اکسایا کہ وہ تعلیم چھوڑ کر سڑکوں پر آجائیں۔ مزدوروں کو انہوں نے اکسایا کہ وہ ہڑتال کر کے کاروبار کو مفلوج کر دیں۔ کسانوں کو انہوں نے اکسایا کہ وہ زمینداروں کی بڑائی تسلیم نہ کریں۔ ٹیکس دینے والوں کو انہوں نے اکسایا کہ وہ گورنمنٹ کو ٹیکس نہ دیں۔ مہاتما گاندھی نے عوام کی طاقت سے آزادی حاصل کر لی۔ مگر یہ آزادی روایات کو توڑ کر حاصل ہوئی تھی۔

روایات کو توڑنے کا یہ سلسلہ آزادی کے بعد مزید شدت کے ساتھ جاری رہا۔ ہر شعبہ میں جلد ترقی کے جوش میں روایات توڑی جاتی رہیں۔ حتیٰ کہ اس ملک میں روایات کا تسلسل ختم ہو گیا۔ اس کی تازہ مثال یہ ہے کہ دہلی کے ڈسٹرکٹ جج مسٹر مہیش چندر کو ترقی دے کر دہلی ہائی کورٹ کا جج بنایا گیا ہے۔ یہ تقرری روایات کو توڑ کر ہوئی ہے۔ انگریزوں کے زمانے سے یہ روایت چلی آرہی تھی کہ سینیارٹی کی بنیاد پر ترقیاں دی جاتی تھیں۔ دہلی میں مسٹر مہیش چندر کے مقابلہ میں دو سینئر جج تھے جو ترقی کے اولاً مستحق تھے، مگر ان کو چھوڑ کر مسٹر مہیش چندر کو ترقی دے دی گئی۔

یہی تمام انقلابی تحریکوں کا حال ہوا ہے۔ خواہ وہ روس کی کمیونسٹ تحریک ہو یا ہندوستان کی

گاندھیائی تحریک یا ایران کی خمینی تحریک۔ ہر ایک نے یہی کیا کہ روایات کو توڑ کر انقلاب لے آئے، اور روایات کو توڑ کر نیا سماج بنانا چاہا۔ نتیجہ یہ ہے کہ بلا استثنا ہر ایک کو اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی۔ انسانی سماج ہمیشہ روایات کے زور پر عمل کرتا ہے اور روایات کے زور کو یہ تحریکیں پہلے ہی ختم کر چکی تھیں۔

اس عموم میں صرف ایک نمایاں استثنا ہے اور وہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے۔ پیغمبر اسلام تاریخ کی واحد شخصیت ہیں جنھوں نے روایات کو توڑے بغیر انقلاب برپا کیا اور روایات کو توڑے بغیر اپنی مطلوبہ اصلاحات رائج کیں۔ آپ کی زندگی کا تنہا یہی پہلو یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ آپ خدا کے رسول تھے۔

12 جولائی 1986

امریکن رائٹر امبروز بیرس (Ambrose Gwinnett Bierce, 1842-1914) کا ایک قول ہے:

> Philosophy is a route of the many roads leading from nowhere to nothing.

فلسفہ بہت سے راستوں کا ایک سفر ہے جو کہیں سے نہ شروع ہوتا اور نہ کہیں ختم ہوتا ہے۔

فلسفہ کو قدیم زمانے میں علوم کی ملکہ (Queen of Arts) کہا جاتا تھا۔ پچھلے 5000 سال کے اندر اعلیٰ ترین دماغوں نے فلسفہ کے میدان میں اپنی محنتیں صرف کی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ فلسفہ کی تحقیق پر جتنا کام ہوا ہے، اتنا کسی بھی دوسرے شعبہ علم میں نہیں ہوا۔ اس کے باوجود فلسفہ ہی واحد علمی شعبہ ہے جس کا کوئی مثبت حاصل نہیں۔ فلسفہ نے ذہنی الجھاؤ اور پُر پیچ بحثوں کے سوا انسان کو کچھ اور نہیں دیا۔ حتیٰ کہ آج تک یہ بات بھی واضح نہ ہو سکی کہ فلسفہ کا آغاز کیا ہے اور اس کا انتہا کیا۔

فلسفہ کی اس ناکامی کی وجہ صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ فلسفہ ایک ایسے میدان میں کام کر رہا ہے جہاں کوئی حقیقی کامیابی حاصل کرنا اس کے لیے ممکن ہی نہیں۔

فلسفہ کا خلاصہ ایک لفظ میں یہ ہے: آخری حقیقت (ulltimate reality) کو عقل کے

ذریعہ دریافت کرنا۔ چونکہ انسان کی عقل محدود ہے، وہ کلی حقیقت کا احاطہ نہیں کرسکتی۔ انسان اپنی محدودیتوں (limitations) کی وجہ سے تنہا حقیقت اعلیٰ کو دریافت نہیں کرسکتا۔ یہی واحد وجہ ہے جس کی بنا پر فلسفہ اپنی کوششوں میں ناکام رہا۔

اس محدودیت کی بنا پر انسان کے لیے اس دنیا میں صرف دو options ہیں۔ یا تو وہ جزئی علم پر قناعت کرے جیسا کہ سائنس نے موجودہ زمانہ میں کیا ہے یا وہ الہام سے مدد لے کر کلی حقیقت تک پہنچے۔ ان دو کے سوا تیسری کوئی صورت اگر ہے تو وہ صرف تشکیک ہے اور تشکیک عملی طور پر ممکن نہیں۔

حکمت کیا ہے

قرآن میں اللہ کے رسول کے بارے میں آیا ہے کہ وہ کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں (البقرہ، 2:151)۔ لیکن حکمت ایسی چیز نہیں جو محض الفاظ کے ذریعے مکمل طور پر منتقل کی جا سکے، جیسے کہ قرآن کو الفاظ میں نازل کیا گیا۔ حکمت کو الفاظ میں قید نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ اس کا تعلق زندگی کے مختلف حالات سے ہوتا ہے۔ حکمت ایسی چیز ہے جسے عملی تجربات اور حالات کے تحت اخذ کرنا پڑتا ہے، اور جیسا کہ معلوم ہے وقت اور حالات کبھی یکساں نہیں رہتے، اس لیے ہر دور میں گہری بصیرت کے ذریعے حکمت کو دریافت کرنا ہوتا ہے۔

بدلتے ہوئے اور ناموافق حالات میں کسی اقدام کو کامیابی سے ہمکنار کرنا — یہی دراصل حکمت ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا گہرا مطالعہ کیا جائے، اور اس میں بصیرت کے ساتھ پیغمبرانہ حکمت کو دریافت کیا جائے۔ مثلاً: آپ کی بعثت کے وقت خانہ کعبہ میں بت رکھے ہوئے تھے، لیکن اس معاملے میں آپ نے کوئی لفظی ہدایت نہیں دی۔ اس کے بجائے، آپ نے اپنے عمل سے رہنمائی کی۔ لہٰذا ہمیں بھی غور و فکر کے ذریعے آپ کے طرزِ عمل سے حکمتیں اخذ کرنی ہوں گی۔

فقہا نے فقہ کو صرف مسائلِ احکام تک محدود کر دیا، مزید یہ کہ فرضی مسائل کا ایک انبار کھڑا کر دیا، مگر یہ ایک ایسی روش تھی، جس کو ان سے پہلے صحابہ کرام اور تابعین نے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا تھا۔ اصل فقہ اُن حقیقی حالات میں پوشیدہ ہے جن کا سامنا پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہوا۔ اگر ان پر سنجیدگی سے غور کیا جائے تو حکمت کے بہت سے نئے گوشے کھل کر سامنے آتے ہیں، جن پر غور و فکر کر کے ہم انہیں موجودہ حالات کے مطابق اختیار کرسکتے ہیں۔ (مولانا وحید الدین خان صاحب سے گفتگو پر مبنی)

ایک انٹرویو

(زیرنظر انٹرویو مسٹر یوگندر سکند (پیدائش 1967) نے 10 اگست 2007 کو لیا تھا۔ اس کی ریکارڈنگ بھی ہوئی تھی، جو سی پی ایس سینٹر میں موجود ہے۔ اس انٹرویو کا خلاصہ افادیت کے پیش نظر دوبارہ شائع کیا جارہا ہے)

س: آپ مدارس کے نظام کو کس طرح دیکھتے ہیں؟ اس وقت مدارس کے نصاب ونظام میں اصلاح کی ضرورت کی بات ہورہی ہے؟

ج: بعض دوسرے لوگوں کی طرح میں مدارس کا مخالف یا اس کا ناقد نہیں ہوں۔ مسلمانوں کو مذہبی اور سیکولر دونوں نظام ہائے تعلیم کی ضرورت ہے۔ مسلم بچوں کو دونوں طرح کے مضامین کی واقفیت ہونی چاہیے۔ لیکن تمام مسلم طلبہ کے لیے یہ مطلقاً ضروری نہیں کہ وہ کل وقتی طور پر مدرسہ جا کر عالم بننے کی تربیت حاصل کریں۔ البتہ اتنا ضروری ہے کہ سماج کا ایک طبقہ علم دین حاصل کرے تا کہ مذہبی تعلیم کے حصول کی روایت باقی رہے۔ ہمیں مدارس کے تربیت یافتہ ایسے علما کی ضرورت ہے جو قرآن، حدیث، فقہ اور عربی زبان کے واقف کار ہوں۔ جہاں تک مدارس میں اصلاح کی ضرورت کا سوال ہے حقیقت یہ ہے کہ میں مدارس کی جدیدکاری میں یقین نہیں رکھتا۔ آپ قرآن وحدیث کی جدیدکاری نہیں کرسکتے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس سیاق میں جدیدکاری یا جدت پسندی کی بات بالکل بے محل اور غیر ضروری ہے۔ جدیدکاری کے تعلق سے میں کہنا چاہوں گا کہ ہمارے جدید اسکول اور یونیورسٹیوں میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس نکتے کو وہ لوگ جو مدارس میں اصلاح کے زبردست طور پر حامی ہیں، فراموش کردیتے ہیں۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تعلیم کا کوئی بھی نصاب ہر طرح سے مکمل نہیں کہا جا سکتا۔ نصاب سے زیادہ اہمیت اس کو پڑھانے والے کی ہے۔ اس لیے کہ کتابیں نہیں پڑھاتیں اساتذہ پڑھاتے ہیں۔ بعض لوگوں کا کہنا ہے کہ مدارس میں فلسفے اور منطق کی صدیوں پرانی یونانی کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ لیکن ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ

یونیورسٹیز کے انگریزی شعبے میں بھی صدیوں سال پہلے لکھی ہوئی کلاسیکل کتابیں پڑھائی جاتی ہیں۔ میری نظر میں نصاب کا مسئلہ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اصل مسئلہ باصلاحیت اور ذمہ دار اساتذہ کا ہے۔ہمیں اصلاًان کی ضرورت ہے۔

س: تو کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ مدارس کے طلبہ کو جدید مضامین سے روشناس کرانے کی ضرورت نہیں ہے؟

ج: میری تجویز یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے علاحدہ ایسے تعلیمی ادارے قائم کیے جانے چاہئیں جہاں مدارس کے طلبہ فراغت کے بعد جدید مضامین کی تعلیم حاصل کرسکیں۔ خاص طور پر مختلف زبانیں جیسے انگریزی، ہندی، وغیرہ۔ خود میں نے ایک روایتی مدرسے میں تعلیم مکمل کی اور پھر اپنے طور پر انگریزی سیکھی اور دوسرے جدید مضامین پڑھے۔ میرا خیال ہے کہ مدارس کے نصاب کے ساتھ ساتھ اگر مدارس کے طلبہ کو جدید مضامین پڑھنے پر مجبور کیا جائے تو بلاشبہ یہ ان پر بوجھ بن جائے گا جسے وہ نہیں اٹھا پائیں گے۔ اس سے مدرسے کا تعلیمی نظام بکھر جائے گا۔

س: حالیہ دنوں میں مدارس کے فارغ طلبہ کے لیے اس طرح کے ادارے جس کا آپ نے حوالہ دیا ہے، قائم کیے گئے ہیں، آپ اس ظاہرے کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں؟

ج: میری نظر میں یہ نہایت خوش آئند قدم ہے۔ اگرچہ اسے مزید منظم انداز میں کیا جانا چاہئے۔ اس طرح کے اداروں میں بہر حال ایسے اساتذہ کی کمی ہے جو پوری اسپرٹ کے ساتھ تدریسی ذمہ داری نبھانے پر کمر بستہ ہوں۔ ہمارے دور میں مدرسۃ الاصلاح میں ایسے اساتذہ تھے۔ انہوں نے ہمارے اندر تلاش وتجسس کی روح پیدا کی۔ تلاش وتجسس کی یہی روح اصل میں علم ومعرفت کی بنیاد ہے، اس کے بغیر کوئی شخص تعلیم کی راہ پر ترقی نہیں کرسکتا۔ اس روایت کو دوبارہ زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اس وقت ہمارے پاس مدارس کے اساتذہ کی ٹریننگ کے لیے کوئی ادارہ نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ اساتذۂ مدارس کو چھوٹے بچوں کی تعلیم وتربیت اور اس سے متعلقہ امور کی ٹریننگ دی جائے۔ میرے خیال میں یہ ایک اہم اِشو ہے جس پر مسلم تنظیموں کو توجہ دینی چاہیے۔

س:	مدرسہ کے فارغ علما اور یونیورسٹی کے تربیت یافتہ دانش وروں کے درمیان جو شدید دوئی اور ثنویت پیدا ہوگئی ہے، آپ کی رائے میں اسے کس طرح ختم کیا جا سکتا ہے؟

ج:	میرے بچپن میں یہ دوئی اتنی واضح نہیں تھی۔ اس وقت سیکولر تعلیم گاہیں اخلاقی اقدار سے اس قدر دور نہیں تھیں۔ لیکن اب صورتحال بہت زیادہ افسوسناک ہے۔ دونوں طبقوں کے درمیان اس دوئی اور کھائی کو دور کرنے اور پاٹنے کے لیے ضروری ہے کہ دونوں نظام تعلیم کے طلبہ و اساتذہ کے درمیان خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، زیادہ سے زیادہ اختلاط اور میل جول ہو۔ ماضی میں ایسا ہوتا تھا۔ بہت سے ہندو مدرسوں میں پڑھتے تھے، لیکن اب ایسا نہیں ہوتا۔ چونکہ اب ان دونوں طبقوں کے درمیان اس نوع کا میل ملاپ اور باہمی قربت باقی نہیں رہی، اس لیے ان دونوں کے اندر مفاہمت کی کمی پائی جاتی ہے۔

س:	بعض علما آپ کی اس رائے پر چیں بہ جبیں ہوں گے اور کہیں گے کہ اس طرح کے میل جول سے مدرسہ کے طلبہ کی مذہبی نفسیات پر برا اثر مرتب ہوگا۔ اس تعلق سے کیا کہنا چاہیں گے؟

ج:	مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ حضرت عمر فاروق کے بارے میں منقول ہے کہ وہ ہر کسی سے سیکھتے تھے اور ان کا یہ سیکھنا مختلف قسم کے لوگوں سے میل جول کے ذریعہ ہوتا تھا۔ دوسروں کے ساتھ میل جول کے ذریعہ آپ اپنی اخلاقیات کو مزید بہتر بنا سکتے ہیں۔ نیز اس کے ذریعہ آپ دوسرے لوگوں کی صحیح شناخت اور ان کا احترام بھی کر سکتے ہیں۔ مدارس اور ان کے طلبہ کو دوسروں کے ساتھ میل ملاپ پر مائل کرنے اور ان کو مدرسہ کی چہار دیواری سے باہر نکالنے کا سب سے اہم طریقہ یہ ہے ان کے اندر مشنری اسپرٹ بھر دی جائے۔ اس مقصد کے لیے مدارس کی طرف سے کانفرنسیں اور سیمینار منعقد کیے جائیں جن میں مدارس اور یونیورسٹیز کے لوگوں کو، جن میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں شامل ہوں، بلایا جائے۔ یہ طریقہ دونوں طرف معلومات کے دروازے کو کھولنے اور باہمی غلط فہمیوں کو دور کرنے کا زبردست ذریعہ ہوگا۔

خود میری مثال لیجیے! میں روزانہ مختلف مذاہب اور سماجی پس منظر کے لوگوں سے ملتا ہوں۔ میں اسے اللہ کی نعمت سمجھتا ہوں۔ کیونکہ اس عمل کے ذریعہ میں مختلف طرح کی معلومات، دوسروں کے تعلق سے انسانی جذبۂ یکانگت، نئے تجربات اور اخلاقی اقدار سیکھتا اور حاصل کرتا ہوں۔ (جاری)

سادگی کی اہمیت

کہا جاتا ہے کہ زندگی کا بیسٹ فارمولا ہے — سادہ زندگی اور اونچی سوچ:

simple living high thinking

سادہ زندگی اور اونچی سوچ دونوں کا ایک دوسرے سے نہایت گہرا تعلق ہے۔ جہاں سادہ زندگی ہے وہاں اونچی سوچ ہے، اور جہاں اونچی سوچ ہے وہاں سادہ زندگی ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ہم رشتہ (interlinked) ہیں۔ ایک ہے تو دوسرا ہے، ایک نہیں تو دوسرا بھی نہیں۔

سادہ زندگی کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کی ضروریات کے معاملے میں انسان بقدر ضرورت پر قناعت کرے، وہ لگزری (luxury) کے بجائے اشیائے ضرورت پر اکتفا کرے۔ ایسا آدمی غیر ضروری مسائل سے بچ جائے گا۔ وہ ڈسٹریکشن (distraction) سے محفوظ رہے گا۔

سادہ زندگی اور اونچی سوچ دونوں ایک دوسرے کا حصہ ہیں۔ جہاں سادہ زندگی ہوگی، وہاں اونچی سوچ پائی جائے گی، اور جہاں اونچی سوچ ہوگی، وہاں اپنے آپ زندگی میں سادگی اور قناعت پیدا ہوجائے گی۔ اونچی سوچ انسان کے لیے سب سے بڑی چیز ہے۔ لیکن اونچی سوچ کی شرط یہ ہے کہ آدمی سادگی پر قناعت کرے۔ سادگی آدمی کو اِس نقصان سے بچاتی ہے کہ وہ اپنے پیسے یا اپنے ذرائع کو غیر ضروری چیزوں میں لگادے اور پھر وہ مقصد کے حصول میں زیادہ کارگر جدو جہد نہ کرسکے۔ جو آدمی سادگی پر قناعت نہیں کرے گا، وہ غیر ضروری تکلفات میں پھنسا رہے گا۔ وہ ہمیشہ کے لیے اونچی سوچ سے محروم ہوجائے گا۔

زندگی کا لمحہ ایک محدود لمحہ ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اس محدود لمحہ کو بھر پور طور پر استعمال کرے۔ اس دنیا میں زندگی کسی کو صرف ایک بار ملتی ہے۔ یہ آدمی کے اوپر ہے کہ وہ چاہے تو وقت کو استعمال کرے، یا وہ اس کو کھودے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کسی مرد یا عورت کے پاس جو سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے، وہ وقت ہے، اور وقت کا معاملہ یہ ہے کہ وہ کسی آدمی کو صرف ایک بار ملتا ہے۔ کسی نے درست طور پر کہا ہے: گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں۔

हर चीज़ एक इम्तिहान का पेपर है

हदीस में आया है कि रसूल अल्लाह सल्लल्लाहु अलैहि वसल्लम ने एक सहाबी को नसीहत करते हुए फ़रमाया: “जो तुम्हें मिला, वह कभी तुमसे खोने वाला नहीं था; और जो तुमसे खो गया, वह कभी तुम्हें मिलने वाला नहीं था।” (मुसनद अहमद, हदीस संख्या 21589)।

इस हदीस पर ग़ौर करने से मालूम होता है कि मौजूदा दुनिया में किसी इंसान को जो कुछ मिलता है, वह न तो इत्तेफ़ाक़न (संयोगवश) मिलता है और न ही इनाम के तौर पर। इस दुनिया में जो कुछ इंसान को मिलता है, वह केवल इम्तिहान के पेपर के तौर पर मिलता है। ख़ुदा के फ़ैसले के तहत, हर औरत और मर्द को कुछ चीज़ें दी जाती हैं, ताकि उनमें आज़माकर देखा जाए कि इंसान का रवैया कैसा है। कभी ख़ुदा कोई चीज़ देकर इम्तिहान लेता है कि इंसान ने उस पर शुक्र किया या उसे पाकर घमंड में पड़ गया। इसी तरह कभी कोई चीज़ छीनकर ख़ुदा इंसान का इम्तिहान लेता है कि उससे महरूम होकर उसने सब्र किया या शिकायत की मानसिकता में फँस गया।

यह ख़ुदा का तख़्लीकी नक़्शा है। ऐसी स्थिति में इंसान की नज़र इस पर नहीं होनी चाहिए कि उसने क्या पाया और उससे क्या छीना गया। इसके बजाय उसका सारा ध्यान इस पर होना चाहिए कि जिन हालात में रखकर ख़ुदा ने उसका इम्तिहान लेना चाहा था, उसमें उसने मुनासिब (उपयुक्त) प्रतिक्रिया दिया या वह मुनासिब प्रतिक्रिया देने में नाकाम हो गया।

यह ज़िंदगी का सकारात्मक नज़रिया है।, और यह ज़िंदगी का सकारात्मक फ़ॉर्मूला भी है। जिस इंसान में यह मिज़ाज पैदा हो जाए, वह कभी तनाव में नहीं पड़ेगा। वह किसी भी हाल में न मायूस होगा और न ही कड़वाहट का शिकार

होगा। कोई भी तज़ुर्बा उसे ज़िंदगी की तामीरी (रचनात्मक) राह से हटाने वाला साबित नहीं होगा। वह कभी वैचारिक उथल-पुथल में नहीं पड़ेगा। उसकी ज़िंदगी में कभी यह हादसा पेश नहीं आएगा कि उसकी ज़िंदगी मुश्किल हालात में उलझकर रह जाए और वह अपनी आख़िरी मंज़िल तक न पहुंच सके।

आत्महत्या: सबसे बड़ा पागलपन

आत्महत्या सबसे बड़ा पागलपन है, क्योंकि यह वह कार्य है जो व्यक्ति तब करता है जब वह सबसे अधिक शक्ति के साथ कुछ करने की स्थिति में होता है। सच्चाई यह है कि आत्महत्या करना किसी भी व्यक्ति के लिए अत्यंत कठिन काम है। सामान्य स्थिति में, कोई भी व्यक्ति खुद को मारने के लिए तैयार नहीं होता। तो फिर कोई आत्महत्या जैसा चरम कदम क्यों उठाता है? जब किसी इंसान को कोई बड़ा या दुखद झटका लगता है, तो उसका दिमाग अंदर जमा हुई ताकत या ऊर्जा को अपने आप बाहर निकाल देता है। इसके फलस्वरूप उस समय व्यक्ति की शक्ति बढ़ जाती है। यह बढ़ी हुई शक्ति इसलिए होती है कि व्यक्ति आने वाली समस्या का अधिक ताकत के साथ सामना कर सके, लेकिन वह इस ऊर्जा का गलत उपयोग करके आत्महत्या कर लेता है।

यही कारण है कि जो लोग आत्महत्या का प्रयास करते हैं लेकिन किसी कारण से जीवित बच जाते हैं, वे अपनी बाद की जिंदगी में और भी बड़े काम करने में सक्षम हो जाते हैं। आत्महत्या के प्रयास का अनुभव उन्हें जानबूझकर या अनजाने में अपनी छिपी हुई शक्ति से परिचित कराता है। इसलिए, मौत से बचने की स्थिति में वे इस शक्ति का भरपूर उपयोग करते हैं और अधिक बड़ी सफलताएँ हासिल कर लेते हैं। इस प्राकृतिक सिद्धांत को शेख सादी ने सरलता से इस प्रकार समझाया है:

> "क्या तुमने देखा नहीं कि जब बिल्ली बेबस हो जाती है,
> तो अपने पंजों से चीते की आंखें भी नोच सकती है?"

ज़्यादातर इंसानी गलतियाँ प्रकृति के कानूनों को न समझने के कारण होती हैं। प्रकृति के नियमों के अनुसार, इंसानी दिमाग में हमेशा सुरक्षित शक्ति मौजूद रहती है, जो किसी कठिन परिस्थिति के समय स्वचलित (automatic) रूप से छोड़ दी जाती है। यह वैसे ही है जैसे नदी में पानी की कमी होने पर बांध को खोलकर अतिरिक्त पानी छोड़ा जाता है। सच्चाई यह है कि यदि मनुष्य प्रकृति के नियमों को समझे, तो वह कई मूर्खताओं और असफलताओं से बच सकता है।

आसान विकल्प का चयन—एक सुन्नत

हज़रत आयशा (रज़ियल्लाहु अन्हा) की एक रिवायत मामूली शब्दों के फर्क के साथ हदीस की करीब सभी शीर्ष पुस्तकों में आई है। इस रिवायत में हज़रत आयशा ने रसूलुल्लाह (स्ल्ल०) की सामान्य नीति का उल्लेख किया है। सहीह अल-बुख़ारी में यह रिवायत तीन अध्याय के तहत दर्ज है। इस रिवायत के शब्द इस प्रकार हैं:

> "जब भी रसूलुल्लाह (स्ल्ल०) को दो में से किसी एक विकल्प का चयन करना होता, तो आप हमेशा दोनों में से आसान विकल्प का चयन करते। (सहीह अल-बुखारी, हदीस संख्या 6786)

यह हदीस अत्यंत महत्वपूर्ण है। इसमें पैगंबर इस्लाम (स्ल्ल०) की सामान्य नीति को बयान किया गया है, लेकिन हैरानी की बात है कि मुहद्दिसीन ने इसकी ज़्यादा व्याख्या नहीं की। इब्न-हजर की फतह अल-बारी को हदीस का इनसाइक्लोपीडिया माना जाता है। इब्न हजर ने इस हदीस की व्याख्या तीन अध्यायों के अंतर्गत की है, लेकिन उन्होंने इसकी कोई स्पष्ट व्याख्या नहीं की।

उन्होंने केवल यह लिखा है कि इस "तख्यीर" (चयन) का संबंध दुनियावी मामलों से है, लेकिन उन्होंने इन दुनियावी मामलों की कोई ठोस व्यावहारिक मिसाल नहीं दी। (फतह अल-बारी, जिल्द 12, पृष्ठ 88)।

यह एक ज्ञात बात है कि हर सिद्धांत का एक व्यावहारिक अनुप्रयोग होता है। उदाहरण के लिए, अध्यात्म के व्यावहारिक अनुप्रयोग को अप्लाइड स्पिरिचुएलिटी (Applied Spirituality) कहा जाता है। इसी तरह, विज्ञान के व्यावहारिक अनुप्रयोग को अप्लाइड साइंस (Applied Science) कहा जाता है। इसी तरह, हज़रत आयशा (रज़ियल्लाहु अन्हा) द्वारा वर्णित सिद्धांत का भी एक अप्लाइड प्रिंसिपल (Applied Principle) है। लेकिन इस अप्लाइड प्रिंसिपल की मिसालें किसी भी हदीस के व्याख्याकार के यहां नहीं मिलतीं। मेरे ज्ञान के अनुसार, इस्लाम के पूरे इतिहास में किसी भी आलिम या लेखक ने हज़रत आयशा द्वारा वर्णित इस सिद्धांत के व्यावहारिक अनुप्रयोग को विस्तार और स्पष्टता के साथ बयान नहीं किया।

इस्लामी साहित्य का यह अभाव निस्संदेह एक बड़ा नुकसान है। हम जानते हैं कि क़ुरआन में नमाज़ के बारे में यह आदेश दिया गया है: "नमाज़ क़ायम करो।" (2:43) । यह नमाज़ के बारे में एक सिद्धांत है। इसके बाद यह सवाल था कि इस सिद्धांत का व्यावहारिक अनुप्रयोग क्या है। उलमा ने हदीसों का अध्ययन करके नमाज़ की व्यावहारिक विधि यानी अप्लाइड सलाह (Applied Advice) पर कई पुस्तकें लिखीं। इसका परिणाम यह हुआ कि उम्मत को निःसंदेह पता चल गया कि नमाज़ का व्यावहारिक स्वरूप क्या है। अगर ऐसा न हुआ होता, तो लोग नमाज़ के आदेश को तो जानते, लेकिन उसकी व्यावहारिक विधि से अनजान होने की वजह से वे नियमित रूप से नमाज़ अदा करने से वंचित रह जाते।

इसी प्रकार हज़रत आयशा (रज़ियल्लाहु अन्हा) की इस रिवायत के बारे में भी

यही अपेक्षा थी। यहाँ भी यह ज़रूरत थी कि रसूलुल्लाह (स्ल्ल०) की सामान्य नीति को बताते हुए उसके व्यावहारिक अनुप्रयोग को भी बताया जाता, अर्थात यह बताया जाता कि पैगंबर ने अपनी 23 साल की पैग़ंबरी की ज़िंदगी में इस सिद्धांत को कैसे व्यावहारिक रूप से अपनाया। दुर्भाग्य से इस मामले में यह कार्य नहीं हो सका।

हज़रत आयशा की उपर्युक्त हदीस के बारे में भी यही बात आवश्यक थी। यहाँ भी यह जरूरी था कि हम न केवल रसूल अल्लाह की सामान्य नीति को बताते, बल्कि उसके व्यावहारिक अनुप्रयोग को भी बताते। यानी यह बताया जाता कि रसूल अल्लाह ने अपनी 23 साल की पैग़म्बरी की ज़िन्दगी में इस सिद्धांत को किस प्रकार व्यावहारिक रूप से अपनाया। दुर्भाग्यवश, इस दूसरे मामले में यह काम नहीं हो सका। इसके परिणामस्वरूप, अब यह स्थिति है कि हज़रत आयशा की यह मूल्यवान हदीस, हदीस किताबों में मौजूद है, लेकिन उम्मत इस के व्यावहारिक अनुप्रयोग से पूरी तरह अनजान है। खासकर आधुनिक समय में मुसलमानों की दयनीय स्थिति का सबसे बड़ा कारण रसूल अल्लाह की इस सुन्नत से लोगों की अज्ञानता है।

पैग़म्बर इस्लाम ने फरमाया: “तुम दुश्मन से मुठभेड़ की इच्छा न करो, बल्कि अल्लाह से सलामती की दुआ करो”:

> Don't wish confrontation with your enemy,
> ask always peace from God.

जैसा कि उल्लेख किया गया, हज़रत आयशा ने पैग़म्बर इस्लाम की सामान्य नीति को इन शब्दों में बयान किया है: “जब भी रसूल अल्लाह को दो मामलों में से किसी एक का चयन करना होता, तो आप हमेशा दोनों में से आसान विकल्प का चयन करते” (सहीह अल-बुखारी, हदीस संख्या 6786):

> Whenever the Prophet had to choose between the two, he always opted for the easier of the two.

इस प्रकार की हदीसों के साथ, यदि हम अल्लाह के रसूल के व्यावहारिक जीवन को देखें और फिर इस मामले की व्याख्या करने की कोशिश करें, तो यह कहना बिल्कुल सही होगा कि इस्लाम में सशस्त्र जिहाद या क़िताल सिर्फ एक अनचाहा विकल्प है, वह कभी भी कोई मनचाहा विकल्प नहीं हो सकता। पैग़म्बर इस्लाम की ज़िन्दगी के घटनाएँ स्पष्ट रूप से इस दृष्टिकोण की पुष्टि करती हैं।

पैग़म्बर इस्लाम ने 610 ईस्वी में मक्का में तौहीद के मिशन की शुरुआत की। उस समय मक्का शिर्क का केंद्र बना हुआ था। चूँकि वहाँ के बहु-ईश्वर में विश्वास करने वाले आपके दुश्मन बन गए, फिर भी आपका मिशन फैलता रहा और लोग आपके साथी बनते रहे। इस प्रकार तेरह साल गुज़र गए। अब मक्का के विरोधियों ने यह निर्णय लिया कि वे आपको मार डालेंगे।

यह 622 ईस्वी का घटना है। उस समय आपको दो में से एक के चयन का अवसर था। एक यह कि मक्का के सरदारों की युद्धकालीन चुनौती को स्वीकार करते हुए, उनसे सशस्त्र मुकाबला करें। उस समय तक मक्का और उसके आस-पास के इलाकों में कई सौ लोग आपके ऊपर ईमान लाकर आपके साथी बन चुके थे, इस दृष्टि से यह विकल्प आपके लिए एक संभावित विकल्प था।

आपके लिए दूसरा विकल्प यह था कि आप सशस्त्र संघर्ष से परहेज करें, चाहे इसके लिए आपको मक्का से हिजरत (पलायन) करनी पड़े, यानी आप शांतिपूर्वक मक्का छोड़कर चले जाएं, आपने यही दूसरा तरीका अपनाया। आपने सशस्त्र संघर्ष का तरीका छोड़ दिया और शांतिपूर्ण हिजरत का तरीका अपनाकर आप मदीना चले गए। हालांकि आम लोगों की नज़र में यह कोई सम्मानजनक तरीका नहीं था। चूँकि धर्मनिरपेक्ष इतिहासकारों ने इस घटना को हिजरत के बजाय 'फरार' (flight) का नाम दिया है।

इसी तरह का एक घटना है जिसे सुलह-ए-हुदैबिया कहा जाता है। जब रसूल अल्लाह मक्का छोड़कर मदीना आ गए, तो आपको यह अवसर मिला कि आप

ईश्वर के संदेश से लोगों को अवगत करने का काम बड़े पैमाने पर अंजाम दे सकें। यह बात मक्का के सरदारों को पसंद नहीं आई। उन्होंने आपके खिलाफ नियमित रूप से हमला शुरू कर दिया। उस समय आपने मक्का के सरदारों से बातचीत (negotiation) का सिलसिला शुरू किया। इस बातचीत का उद्देश्य यह था कि आप और मक्का वालों के बीच शांति का समझौता हो जाए। यह बातचीत, हुदैबिया के स्थान पर दो हफ्ते तक जारी रही।

इस बातचीत के दौरान यह स्पष्ट हुआ कि दूसरे पक्ष अपनी एकतरफा शर्तों पर अडिग था। वे लोग इस मामले में किसी भी प्रकार से झुकने के लिए तैयार नहीं हुए। आखिरकार, पैग़म्बर इस्लाम ने कुरैश के सरदारों की एकतरफा शर्तों को मान लिया, ताकि दोनों पक्षों के बीच शांति कायम हो सके। इस प्रकार सुल्हे हुदैबिया संपन्न हुई, जो दरअसल आपके और दूसरे पक्ष के बीच दस साल का ना-जंग समझौता (no-war pact) था। इस घटना के माध्यम से पैग़म्बर इस्लाम ने उम्मत को यह उदाहरण दिया कि सशस्त्र संघर्ष का चयन किसी भी स्थिति में नहीं करना है, कोई भी कीमत चुकाकर हर हाल में शांति कायम रखनी है— इस्लाम में शांति की स्थिति सामान्य है और युद्ध की स्थिति केवल अपवाद है।

(विस्तार के लिए कृपया देखें लेखक की किताबें— "मुताला-ए-सीरत", और "अमन-ए-आलम", आदि)

जीवन के उस पार

आदमी बाहरी तौर पर एक पूर्ण अस्तित्व जान पड़ता है, लेकिन सच में वह केवल एक अधूरा अस्तित्व है। इंसान के पास आँखें हैं, लेकिन बाहरी रोशनी के बिना वह नहीं देख सकता। इंसान के पास कान हैं, लेकिन हवा के बिना वह सुन

नहीं सकता। इंसान के पास चलने के लिए पैर हैं, लेकिन अगर पृथ्वी में संतुलित गुरुत्वाकर्षण (Gravitational force) बल न हो, तो वह चल नहीं सकता। इंसान के पास खाने के लिए मुँह है, लेकिन अगर बाहर भोजन का सामान न हो, तो वह खाने की आवश्यकता पूरी नहीं कर सकता।

अब एक ऐसे समय की कल्पना कीजिए, जब आप पूरी तरह से अपने इस अस्तित्व के साथ जीवित होंगे, लेकिन वहां आपकी जरूरत के सभी बाहरी साधन आपसे छिन चुके होंगे। आपके पास आँखें होंगी, लेकिन देखने के लिए बाहरी रोशनी मौजूद नहीं होगी। आपके पास मुँह होगा, लेकिन खाने की चीज़ें वहाँ से गायब हो चुकी होंगी। आपके पास पैर होंगे, लेकिन वहाँ संतुलित गुरुत्वाकर्षण वाली ज़मीन आपके पैरों के नीचे मौजूद नहीं होगी। और साथ ही, आप अकेले होंगे, आपके सभी अपने लोग आपका साथ छोड़ चुके होंगे।

यह कोई काल्पनिक बात नहीं है। यही स्थिति हर महिला और पुरुष के साथ मौत के बाद सामने आएगी, और मौत हर महिला और पुरुष पर जरूर आनी है। जो भी व्यक्ति आज जीवित है, वह एक दिन मर जाएगा। और फिर मौत के बाद, वह अपने आप को जिस दुनिया में पाएगा, वह वही दुनिया होगी जिसका वर्णन ऊपर किया गया है।

यह आने वाला दिन हर किसी के लिए तेज़ी से नज़दीक आ रहा है। हर महिला और पुरुष की पहली आवश्यकता यह है कि वह इस आने वाले दिन को समझे और इसके लिए तैयारी करे। वह दिन जब आएगा, तो वह "पॉइंट ऑफ नो रिटर्न" (point of no return) पर आएगा। इसके बाद आदमी को केवल भुगतना होगा, उस दिन के लिए तैयारी का अवसर उसे पुनः प्राप्त नहीं होगा। जन्म के बाद ही हर महिला और पुरुष का काउंटडाउन (countdown) शुरू हो जाता है। किसी को नहीं पता कि उनका यह काउंटडाउन कब अपने अंतिम नंबर पर पहुंच जाएगा।

गंतव्यहीन दौड़

हर व्यक्ति बिना थके बोल रहा है। हर व्यक्ति अपनी जरूरतों को अंतिम सीमा तक बढ़ा चुका है। हर कोई अपनी इच्छाओं को अनंत रूप से पूरा करना चाहता है। हर व्यक्ति चाहता है कि वह आराम और सुख की सारी चीजें अपने लिए और अपने बच्चों के लिए जमा कर ले। यह सांसारिक मोह की ओर एक पागल दौड़ है, लेकिन इसका परिणाम क्या निकल रहा है? हर व्यक्ति इस एहसास में जीता है कि उसकी इच्छाएं पूरी नहीं हुईं। जो संतोष वह चाहता था, वह उसे नहीं मिल सका। हर महिला और पुरुष इसी हताशा के एहसास में जीते हैं। इस स्थिति में उनका दिन और रात बीतता रहता है, जब तक कि उनकी इच्छाओं का घरोंदा कुछ स्थितियों के तूफान से टकराकर बिखर नहीं जाता। और यदि स्थितियां उसे न तोड़ें, तो मौत अपने समय पर आती है और हर किसी को मजबूर करती है कि वह मौत के निर्दयी फैसले को स्वीकार करे, जैसे दुनिया में पहले आने वाले सभी लोग इस फैसले को मजबूरी में स्वीकार कर चुके हैं।

लोग मौत से पहले के अस्थायी जीवन के लिए प्रबंध करने में व्यस्त हैं, जबकि असली आवश्यकता यह है कि मौत के बाद के सदैव के जीवन के लिए खुद को तैयार किया जाए। मौत से पहले का जीवन एक परीक्षा का जीवन है। इस आधार पर यह अल्लाह की जिम्मेदारी है कि वह हर एक को वह सामान प्रदान करे, जिससे वह अपनी परीक्षा दे सके। लेकिन जहां तक मौत के बाद के जीवन का सवाल है, उसकी ज़िम्मेदारी अल्लाह ने नहीं ली है। मौत के बाद का जीवन पूरी तरह से आदमी के अपने कार्यों पर निर्भर करता है।

वर्तमान जीवन का सिद्धांत यह है कि कुछ भी न करो, फिर भी तुम्हें ज़रूरत भर सामान एकतरफा रूप से दी जाएगी। लेकिन आने वाले जीवन का मामला इससे बिल्कुल अलग है। अगले जीवन का सिद्धांत है — जैसा बोओगे, वैसा काटोगे। लेकिन अजीब बात यह है कि लोग वर्तमान जीवन के लिए तो खूब दौड़-धूप

कर रहे हैं, लेकिन अगले जीवन को पूरी तरह से भूल चुके हैं। वर्तमान जीवन में आज की कमी को कल के दिन अधिक कार्य करके पूरा किया जा सकता है, लेकिन अगले जीवन में किसी महिला और पुरुष को यह अवसर नहीं मिलेगा कि वह अपने अतीत की कमियों की फिर से भरपाई कर सके।

हर तरफ़ बेखौफ़ी

बहुत कम लोग ऐसे हैं जो यह मानते हों कि उनकी ज़िन्दगी सिर्फ मौत पर खत्म हो जाएगी और मौत के बाद उन्हें फिर से ज़िन्दगी नहीं मिलेगी। अधिकांश लोग, लगभग 99%, यह मानते हैं कि मौत हमारे जीवन का अंत नहीं है, बल्कि मौत के बाद भी जीवन है जो कि अनंतकाल तक रहेगा।

इस विश्वास के बावजूद लगभग सभी लोग अगले जीवन के बारे में बेखौफ़ हैं। विश्वास के रूप में वे अगले जीवन को मानते हैं, लेकिन उनके व्यावहारिक जीवन में इसका कोई प्रभाव नहीं दिखता। यह बेखौफ़ी इतनी आम है कि इसमें बहुत कम अपवाद पाया जा सकता है।

इसका कारण क्या है? इसका कारण यह है कि प्रत्येक व्यक्ति ने जीवन के बाद मौत के विश्वास के साथ एक और विश्वास अपना लिया है जो जीवन के बाद मौत के विचार को उसके लिए एक ऐसा विचार बना देता है जो सिर्फ एक पारंपरिक विश्वास से अधिक कुछ नहीं होता।

यहूदी धर्म से संबंधित लोग जीवन के बाद मौत के विश्वास को मानते हैं, लेकिन इसी के साथ-साथ उनका यह विश्वास भी है कि यहूदी कौम, अल्लाह की विशेष कौम है (अल-माइदा, 5:18)। वे सभी इस विश्वास रखते हैं कि वे किसी भी हालत में मौत के बाद स्वर्ग में ज़रूर जाएंगे। इस निश्चित मुक्ति के विश्वास ने यहूदी लोगों को परलोक के बारे में बेखौफ़ बना दिया है।

मसीही धर्म के लोग भी मौत के बाद जीवन का विश्वास रखते हैं, लेकिन साथ ही उनका यह भी विश्वास है कि ईसा मसीह ने उनकी गलतियों का प्रायश्चित किया है। अब प्रत्येक मसीही की मुक्ति निश्चित है। इस विश्वास ने मसीही लोगों को भी परलोक के बारे में बेखौफ़ बना दिया है।

इस मामले में ठीक यही स्थिति मुसलमानों की भी है। बेशक सभी मुसलमान, जीवन के बाद मौत के विश्वास को मानते हैं। वे जन्नत और जहन्नम पर विश्वास रखते हैं। लेकिन गहराई से देखा जाए तो आज के लगभग सभी मुसलमान, आखिरत के बारे में बेखौफ हैं, उन्हें अपनी जहन्नम में जाने का कोई डर नहीं है। इसका कारण फिर से यही है कि उन्होंने अपने आप ऐसे काल्पनिक विश्वास बना लिए हैं जिसके अनुसार, उन्हें अपनी आख़िरत की मुक्ति पूरी तरह सुनिश्चित दिखती है।

उदाहरण के तौर पर, सभी मुसलमान, सचेत या अचेतन रूप से यह मानते हैं कि मुसलमान एक विशेष समूह होते हैं। जो कोई भी मुस्लिम परिवार में जन्म लेता है, उसकी जन्नत सुनिश्चित होती है। यह विश्वास निस्संदेह एक स्वयं-निर्मित विश्वास है। इसका क़ुरआन और हदीस से कोई संबंध नहीं है। लेकिन यह इतना सामान्य है कि यह सभी मुसलमानों के दिमाग में बसा हुआ है, चाहे वे मुस्लिम विद्वान हों या आम लोग, अमीर हों या गरीब, विशेष वर्ग से हों या आम जनता से, सभी इसे एक स्थापित सत्य के रूप में स्वीकार करते हैं।

आखिरत का विश्वास इंसान को बुराई से रोकने के लिए एक शक्तिशाली प्रेरक शक्ति होता है, लेकिन जब इस विश्वास के साथ ऊपर वर्णित स्वयं-निर्मित विश्वास जोड़ दिए जाते हैं, तो उसके बाद दूसरे जीवन की मान्यता व्यावहारिक रूप से ऐसी हो जाती है, जैसे उसे न मानना।

अपने लिए पूरा, दूसरों के लिए अधूरा

> "आज मैं तुम्हें अच्छे हाल में देख रहा हूँ, लेकिन मुझे डर है कि कल तुम पर ऐसा दिन आएगा जिसका अज़ाब (दंड) सबको अपने घेरे में ले लेगा।" (सूरह हूद, 11:84)

यह पैग़ाम हज़रत शुऐब अलैहिस्सलाम का था, जो उन्होंने लगभग साढ़े तीन हज़ार साल पहले मदयन की क़ौम को दिया।

मदयन, प्राचीन अरब में बहर-ए-अहमर (Red Sea) के किनारे बसा हुआ एक शहर था। हज़रत इब्राहीम (1985–2160 क़बल मसीह) की बीवी क़तूरा से उनके एक बेटे पैदा हुए जिनका नाम मदयान था। उन्हीं की संतान यहाँ आबाद हुई, और उन्हीं के नाम पर इस शहर को "मदयन" कहा गया।

इन्हीं में हज़रत इब्राहीम के लगभग 5 सौ साल बाद हज़रत शुऐब पैदा हुए। उस समय तक मदयन की क़ौम में काफी बिगाड़ आ चुका था। अल्लाह तआला ने हज़रत शुऐब को नबूवत अता की और उन्हें हुक्म दिया कि वे हज़रत इब्राहीम की इस बिगड़ी हुई औलाद को हक़ का पैग़ाम सुनाएँ।

अब यह सवाल पैदा होता है कि मदयन की क़ौम में कौन सी बुराई थी जिस की वजह से उन्हें यह चेतावनी दी गई कि "अपने आज के अच्छे हालात पर मत इतराओ, आने वाले समय में सख़्त अज़ाब आ सकता है"?

क़ुरआन के मुताबिक़, उनकी बुनियादी बुराई यह थी कि वे नाप-तौल में धोखाधड़ी करते थे, यानी जब खुद कुछ लेते तो पूरा-पूरा लेते और जब दूसरों को देते तो उसमें कमी कर देते। (7:85)

इस नैतिक गड़बड़ी को क़ुरआन ने एक और जगह पर और स्पष्टता से बयान किया है:

> "बर्बादी है उन लोगों के लिए जो तौलने में कमी करते हैं। जिनका हाल यह होता है कि जब वे दूसरों से कुछ लेते हैं तो पूरा-पूरा लेते हैं, लेकिन जब उन्हें दूसरों को देना होता है — नाप या तौलकर — तो वे उसमें घटा देते हैं। क्या उन्हें यह मालूम नहीं कि एक दिन ऐसा आएगा जब उन्हें उठाकर (हिसाब के लिए) लाया जाएगा? उस दिन जब सारे लोग अल्लाह, मालिक-ए-कायनात के सामने खड़े होंगे?" (83:1-6)

"अपने लिए भरपूर लेना और दूसरों को देने में कमी करना" – एक वो है जो दुकानदारों के यहाँ मिलता है। जो दुकानदार खुद के लिए तो नाप और तौल में ज़्यादा लेने की कोशिश करता है, लेकिन जब किसी ग्राहक को कुछ देना होता है, तो किसी न किसी बहाने उसे कम देने की कोशिश करता है — जैसे नाप-तौल में गड़बड़ी करना, मिलावट करना या घटिया चीज़ देना — तो ऐसा इंसान अल्लाह के नज़दीक मलऊन (शापित) है और उसकी पूरी कमाई हराम की है। चाहे वह दुनिया में कितना ही मुनाफ़ा कमा ले, लेकिन आख़िरत के दिन वह सबसे बड़े घाटे में होगा।

लेकिन यह सोच केवल व्यापार तक सीमित नहीं है। यह एक ज़ेहनी रवैया है, जो इंसानी ताल्लुक़ात (रिश्तों) के हर पहलू पर लागू होता है। साहिब-ए-रूहुल मआनी (प्रसिद्ध व्याख्याकार) लिखते हैं:

> "जो अहले-इल्म (विद्वान) अपने समकालीन विद्वानों के आदर सम्मान का हक़ अदा नहीं करते, वे भी इस आयत के दायरे में आते हैं।"

इसी तरह की सभी सूरतों पर इस आयत को लागू किया जा सकता है, जब एक इंसान अपने लिए तो यह चाहता है कि वह अपने असली हक़ से भी ज़्यादा हासिल कर ले, लेकिन दूसरे को उसका वाजिब हक़ भी नहीं देना चाहता।

ऐसी शानदार चीज़ें ख़ुदा के यहाँ कहाँ!

नई दिल्ली के अंतरराष्ट्रीय औद्योगिक मेले (1961) में अमेरिका की ओर से एक हवाई मोटर का प्रदर्शन किया गया था। इसकी विशेषता यह थी कि वह ज़मीन पर दौड़ भी सकती थी और हवा में साठ मील प्रति घंटे की रफ्तार से उड़ भी सकती थी।

जब एक युवा साधु, प्रदर्शनी के विभिन्न अद्भुत और रंगीन नज़ारों को देखते हुए अमेरिकी पवेलियन के पास पहुँचा और उसने इस जादुई गाड़ी को उड़ते और दौड़ते हुए देखा, तो उसके मन में एक नया सवाल पैदा हो गया—"क्या मैं त्याग और बलिदान की ज़िंदगी छोड़कर भौतिक विकास की दुनिया में अपने जज़्बात के लिए सुकून तलाश करूँ?"

गेरुए कपड़ों में लिपटा हुआ और लंबे बिखरे बालों वाला यह भारतीय युवक बीस मिनट तक इस अमेरिकी मोटर को देखता रहा, जिसे प्रदर्शनी के ज़िम्मेदारों ने "भविष्य की कार" का नाम दिया था।

जब उससे इस बारे में राय पूछी गई, तो उसने गहरे असर के साथ जवाब दिया:

> "इसने मुझे इस सोच में डाल दिया है कि दोनों दुनियाओं में से वह कौन-सी दुनिया है, जिसे मैं अपने लिए बेहतर समझूँ।" (हिन्दुस्तान टाइम्स, 20 नवम्बर 1961)

इसी तरह की एक और घटना पढ़िए:

जुलाई-अगस्त 1975 में बिहार में एक भयानक बाढ़ आई थी। इस बाढ़ में बहुत-से परिवार बेघर हो गए और उन्हें मजबूर होकर किसी दूसरी जगह अपने लिए पनाहगाह तलाश करनी पड़ी।

इन्हीं पीड़ितों में से एक ग़रीब मुस्लिम परिवार दिल्ली पहुँचा। घर का मर्द तूफ़ान में ख़त्म हो चुका था। बारह साल का यतीम लड़का शरीफ़ और उसकी दुबली और बीमार माँ, जिन्हें दिल्ली लाने वाली ये उम्मीद थी कि उसका दामाद यहाँ रिक्शा चलाकर अपना रोज़गार कर रहा है।

ज़ाहिर है कि रिक्शा चलाने वाला एक आदमी दो परिवारों का गुज़ारा कैसे कर सकता था। शरीफ़ को रोज़गार तलाशना पड़ा। शुरू में कुछ दिन वह एक मामूली होटल में बर्तन धोने का काम करता रहा। इसके बाद एक संपन्न मुस्लिम परिवार में उसे घरेलू कामों के लिए पचास रुपये माहवार पर जगह मिल गई।

शरीफ़ एक अत्यंत ग़रीब परिवार का लड़का था। इस दुनिया में आँख खोलने के बाद उसे जो बिस्तर मिला वह ज़मीन पर बिछा हुआ एक टाट था। अब तक की ज़िंदगी उसने इस तरह गुज़ारी कि न तो कभी उसके पैरों में जूता पड़ा और न ही उसके शरीर पर कभी पूरा कपड़ा आया। सर्दियों की रातों का मतलब उसके लिए बस इतना था कि लकड़ी के टुकड़े और सूखी पत्तियाँ जमा करके कुछ देर आग और धुएँ के सहारे गुज़ारा किया जाए, और फिर एक फटा हुआ टाट नीचे बिछा लिया जाए और दूसरा फटा हुआ टाट ऊपर ओढ़ लिया जाए।

दिसंबर की एक सुबह की बात है, जब शरीफ़ मकान मालकिन का बिस्तर समेट रहा था। अचानक एक ख़याल उसके ज़हन में रेंगा। मसहरी पर बिछा हुआ मोटा और मुलायम गद्दा, उसके ऊपर सुंदर चादर और मखमली कपड़े से बना हुआ शानदार लिहाफ़ — इन चीज़ों ने उसे थोड़ी देर के लिए स्तब्ध कर दिया।

> "आपा," वह मालकिन की बेटी से बोला, "क्या अल्लाह मियाँ के यहाँ ऐसा बिस्तर होगा?"

वह अपने इस सवाल में इतना खो गया था कि उसे यह भी ध्यान न रहा कि

लड़की यह कहते हुए जा चुकी थी — "बेवक़ूफ़, वहाँ तो इससे भी अच्छे बिस्तर होंगे!"

अगर गहराई से देखा जाए, तो आज के दौर में लगभग हर इंसान इसी मानसिकता में डूबा हुआ नज़र आता है — छोटे हों या बड़े, अमीर हों या ग़रीब, पढ़े-लिखे हों या अनपढ़ — सभी लोग दुनिया की चमक-दमक पर टूटे पड़ते हैं।

लज़्ज़त, दौलत, शोहरत, इज़्ज़त, रुतबा, इख़्तियार — यानी दुनिया की चीज़ों में से अगर किसी एक का छोटा-सा हिस्सा भी किसी के सामने आ जाए, तो वह उसकी ओर ऐसे दौड़ता है...

मानो बिना बोले वो ये कह रहा हो कि — "अल्लाह के यहाँ भला ऐसी शानदार चीज़ें कहाँ मिलेंगी! तो फिर क्यों न इस दुनिया में जो कुछ भी हासिल हो सकता है, उसे ही हासिल कर लिया जाए।"

सबसे ज़्यादा अजीब बात यह है कि इस मामले में धार्मिक लोगों का हाल भी वही है जो अन्य दुनियादारों का है। आज के दौर में जो दुनियावी संभावनाएँ उनके लिए खुली हैं, उनकी तरफ़ दौड़ने में वे भी दूसरों से एक क़दम भी पीछे नहीं हैं।

पदों और ओहदों की धूम, सदर और नाज़िम के सम्मान, जलसों और जुलूसों की दिखावट, अंतरराष्ट्रीय कांफ्रेंसों के लिए हवाई सफ़र, भाषण और स्वागत के तमाशे, अख़बारों की सुर्खियों में छपने की चाह और इसी तरह की दूसरी चीज़ों का शौक़ — उन्हें भी उतना ही है जितना किसी आम दुनियादार को हो सकता है।

ऐसा मालूम होता है कि जो व्यक्ति आख़िरत (परलोक) पर भाषण दे रहा है, उसे खुद आख़िरत पर विश्वास नहीं है — और अगर है, तो बहुत कम।

BOOKS FOR UNDERSTANDING THE SPIRITUAL ESSENCE OF ISLAM

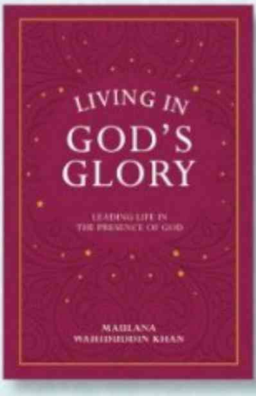

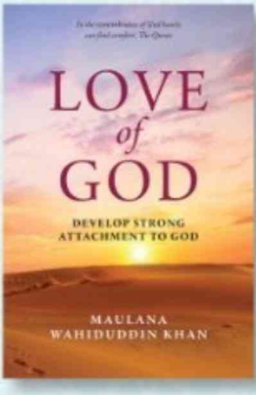

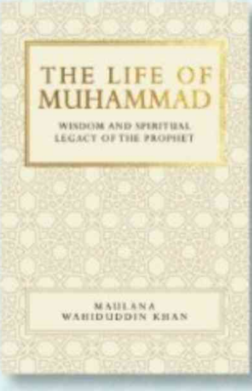

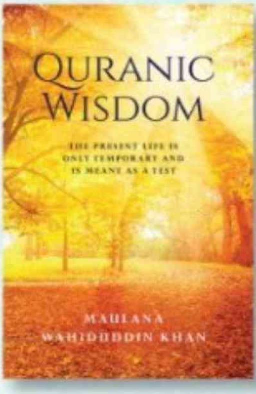

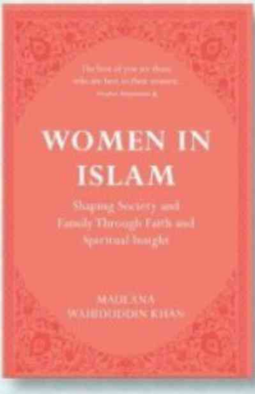

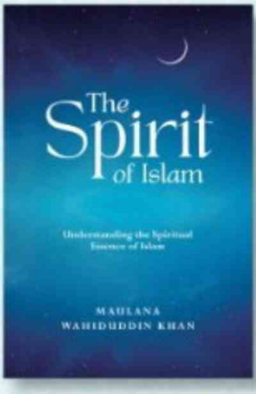

These books provide the general reader with an accurate and comprehensive picture of Islam– the true religion of submission to God.

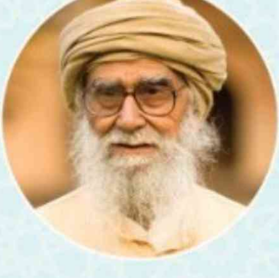

To order call: 8588822675
sales@goodwordbooks.com

www.goodwordbooks.com

Date of Posting 10th and 11th of advance month
Published on the 1st of every month
Posted at NDPSO

Postal Regn. No. DL(S)-01/3130/2021-23
RNI 28822/76
Licenced to Post without Prepayment U (SE) 12/2021-23